(افسانے)

ق

سیّد ماجد شاہ

سیّد ماجد شاہ کے افسانے اس لیے منفرد نہیں ہوتے کہ اُن کے موضوعات عام ڈگر سے ہٹ کر ہیں بلکہ ان افسانوں میں زندگی کے تیکھے اور بھڑکیلے رنگ کچھ ایسی خاص ترکیبی وحدت میں ہم آہنگ ہو کر کہانی کا حصہ بنتے ہیں کہ قاری دورانِ مطالعہ کئی فکری سطحوں پر متحرک ہو جاتا ہے۔ یہ افسانے ذاتی، سماجی، تہذیبی، نفسیاتی اور عافیت کوشی کی فضا میں جنم لیتے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل بیش تر افسانے جدید فکشنی تکنیک اور پیچیدہ اُسلوبِ بیان کی عکاسی کرتے ہیں لیکن یہ ماجد کا کوئی تجربی مسئلہ نہیں ہے یہ تو اُس کا فطری اور فکری اندازِ بیان ہے جس میں علامت، ابہام، تجرید اور ایجاز و جامعیت جیسی صفات کا توازن ہر صاحبِ فکر کو متاثر کرتا ہے۔ ہمیں ان افسانوں میں جن انسانی کرداروں سے متعارف ہونے کا موقع ملا اُن سے ہماری روز ملاقات ہوتی ہے لیکن یہ سب دُھلے دھلائے ملبوسات میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور اپنی اصلیت چھپانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، زیرِ نظر مجموعے میں یہ تمام کردار مصنوعی پردوں سے باہر نکل کر قاری پر منکشف ہو رہے ہیں۔

ع کردار ہیں اور اپنی کہانی سے بندھے ہیں۔۔۔

عامر سہیل

(ایبٹ آباد)

سیّد ماجد شاہ

(افسانے)

سیّد ماجد شاہ

رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

اشاعت : 2016

کتاب : ق (افسانے)

مصنف : سیّد ماجد شاہ

ناشر : محمد عابد

تزئین : خرم شہباز

قیمت : 300 روپے

مطبع : بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

by

Syed Majid Shah

Edition - 2016

اهتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد

Ph: +92-41-2615359 - 2643841, Cell:0300-6668284

email: misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

انتساب

لمس کے نام۔۔۔جو انسان کی اوّلیں حس ہے۔

فہرست

۔۔۔میں کہہ رہا تھا۔۔۔

دیباچہ لکھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پر کیا کروں انوار احمد، عامر سہیل اور کلیم خارجی کی نصیحت اگلتی زبانوں کو گنگ کرنے کا واحد طریقہ یہی تھا۔ لیکن مضمون جیسی نثر لکھنا میرے بس میں تھا نہیں۔ یہاں سرمد سروش کام آیا۔ اس نے کہا: ''دیباچہ افسانوی رنگ میں لکھیں۔'' تو ہمت بڑھ گئی۔۔۔ پتا نہیں اس کا رنگ کیا ہے!

افسانہ اور شاعری، میرے لیے آکسیجن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تخیّل نے میرے لیے دو دنیائیں بنا رکھیں ہیں۔ ایک وہ جس میں، میں چھ ارب لوگوں کے ساتھ تنہا رہتا ہوں۔ یہ دنیا میرے لیے تلخ، بدمزہ، لایعنیت سے لبریز اور چھلکتی بے مقصدیت لیے ہوئے ہے۔ جہاں خودکشی ہمیشہ سے میری ہمزاد رہی ہے۔ دوسری دنیا وہ ہے۔ جہاں کا خالق میں خود ہوں۔ وہ جو کہتے ہیں، ''بگولا رقص میں رہتا ہے صحرا میں نہیں رہتا'' سو میں بھی اپنے ہی کسی شعر یا افسانے میں رہتا ہوں۔

یہ افسانے زندگی سے کشید کیے ہوئے ہیں۔ جو کسی ادبی تحریک، تھیوری یا گروہ کے زیرِ اثر نہیں لکھے گئے۔ نہ ہی یہ صرف قوت تخیّل یا آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے واقعات پر مبنی ہیں۔ ان افسانوں میں میرے ذاتی تجربات اور مشاہدات شامل ہیں۔ کچھ افسانے میری نفسیاتی بیماری سے تعلق رکھتے ہیں۔ جسے میں اپنی دانش مندی سمجھتا

ہوں۔ جتنے واقعات سنے سنائے ہیں، اُن پر ہر ممکن تحقیقی مواد سے استفادہ کیا گیا ہے۔ واقعے کے کردار کے ساتھ وقت گزارا ہے اور بعض اوقات ایک جملہ لکھنے کے لیے، سالوں صرف کیے ہیں۔ کہانی کی تلاش میں عزت، جان اور اخلاقیات کی کبھی پروا نہیں کی۔ بعض اوقات تو سفا کی کا یہ عالم بھی رہا کہ کسی کردار کو مکمل کرنے کے لیے کسی اور جیتے جاگتے انسان کو تختۂ مشق بنایا، اگر یوں نہ کرتا تو میں اس کردار اور واقعے سے کبھی خود مطمئن نہ ہوتا۔ میرا ایمان ہے جو واقعہ ایک بار پیش آتا ہے، ساز گار حالات میں دوبارہ بھی سرزد ہوسکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے نتائج پہلے سے قدرے مختلف ہوں۔

ان افسانوں کی تخلیق کے دوران اگر کسی واقعے، کردار یا کہانی کے حوالے سے، میرے ذہن میں ایک ہزار سوال اٹھ کھڑے ہوئے تو میں نو سو ننانوے درست جواب پا لینے پر بھی کبھی راضی نہ ہوسکا۔ سو جب تک ہر پہلو واضح نہ ہوا، کہانی ذہن کی بھٹی میں نہیں ڈالی گئی۔ ایسا نہیں رہا کہ میرا اطمینان مجھے قلم اُٹھا کر صفحے کالے کرنے پر مجبور کر دیتا۔ جب تک میرا افسانہ خود لاوہ بن کر بیان کی سطح پر نہیں آتا اور بے ساختہ قلم سے سرزد نہیں ہوتا تب تک میں اسے نہیں لکھتا۔ میں ''آمد'' اور ''آورد'' جیسی پرانی اور دقیانوسی باتوں کا قائل ہوں۔ اس سے میری ہر گز یہ مراد نہیں ہے کہ میں آمد کو خدانخواستہ کوئی الہامی چیز سمجھتا ہوں۔ آمد آپ کا علم، آپ کا تجربہ، آپ کا مشاہدہ، آپ کا نقطۂ نظر، آپ کا عقیدہ یا آپ کی وہ نفسیاتی پیچیدگی ہے، جو اپنا تخلیقی دورانیہ پورا کر کے بیان کے در پر اچانک وارد ہوتی ہے۔

پہلے تو میں نظم اور افسانے کے لیے عنوان تراشنے کو جوئے شیر لانے کے مترادف سمجھتا تھا۔ اب پتا چلا کہ کتاب کو نام دینا تو تیشے سے اپنے سر پر ضربِ کاری لگانا ہے۔ کیا کروں کہ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہونا، کتنا مشکل ہے۔ آخر ہم اپنے وسیع اور بکھرے خیالات کی نمائندگی کا شرف، ایک، دو یا چند لفظوں کو کیسے دے سکتے ہیں۔ مجھے افسانوں کی ان کتابوں کے ناموں پر شدید اختلاف ہوا کرتا تھا، جن میں کسی ایک افسانے کے عنوان کو کتاب کے نام کے طور پر منتخب کر لیا جاتا تھا۔ میں اسے باقی افسانوں سے زیادتی

سمجھتا ہوں، کیوں کہ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ آپ اپنی ساری جائداد کسی ایک بیٹے یا بیٹی کے نام کر دیں۔ مگر بہت سوچ بچار کے بعد آخرِ کار مجھے بھی یہی کرنا پڑا۔

میں نے کتاب کا نام اپنے ایک افسانے ''ق'' کے عنوان سے مستعار لیا ہے۔ اس کی وجہ میرے ذہن میں یہ ہے کہ میرے افسانوں کے کئی کردار، موضوعات اور واقعات ایسے ہیں۔ جس میں محض ہم آنکھوں دیکھے پر فیصلہ سنا دیتے ہیں، کبھی ٹھنڈے دماغ سے ''سوچنے'' کی زحمت نہیں کرتے۔ لفظ ''ق'' مجھے ایک ایسی ہی علامت لگتا ہے۔ جس میں آنکھیں ہمیشہ دماغ سے اوپر رکھی جاتی ہیں۔

میرے نزدیک افسانے کا آغاز، اس کا انجام، اس کی زبان، اس کا اختصار، جامعیت اور علامتی اظہار وہ خوبیاں ہیں جو اسے فکشن کی دیگر اصناف سے الگ کرتی ہیں۔ اس کے جملے غزل کے مصرعوں کی طرح جان دار اور گتھے ہوئے ہوں۔ روانی، چاشنی اور نشتریت کے ساتھ اپنے اندر جہانِ معنی رکھتے ہوں کہ جملہ سن کر بے ساختہ ''واہ'' نکلے۔

میں ایک یا دو صفحے کے افسانے کو بیس صفحوں تک پھیلانا، اپنے لیے جائز نہیں سمجھتا۔ سو کبھی بھی کہانی کو کھینچ کھینچ کر پتا مارنے کے حق میں نہیں رہا۔ درحقیقت صفحوں کی تعداد سے افسانے کے مختصر اور طویل ہونے کا فتویٰ ہم نہیں دے سکتے۔ بیس صفحوں کا افسانہ بھی مختصر ہو سکتا ہے۔ جس اختصار کے ساتھ جامعیت ہو، صرف وہی مکمّل افسانہ ہے۔ جامعیت ایک صفحے میں ہو یا بیس صفحات میں آئے۔ مسئلہ صفحوں کا نہیں ہے۔ اکثر، اختصار کے ڈر سے لکھے گئے افسانے، وہ مفلوک الحال بچے ہیں، جو اپنے بڑے بھائی یا باپ کی شلوار قمیص پہنے، غربت کا اشتہار بنے پھرتے ہیں۔ جن پر آپ صرف ترس کھا سکتے ہیں۔ اب اگر کوئی ازراہِ تفنّن یہ کہے کہ لباس اتنا مختصر بھی نہ ہو کہ افسانہ کسی فلم کی ہیروئن دکھائی دینے لگے، تو میں کہوں گا کہ، ''آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔'' افسانے میں ''کہہ دینے'' سے زیادہ ''نہ کہنے'' کا ہنر قاری کے ذوقِ تخیّل کو مہمیز لگاتا ہے۔

قاری کو شروع سے آخر تک انگلی پکڑ کر چلانا بہت ہو چکا۔ افسانے کے قاری

کو اب بڑا ہو جانا چاہیے۔ اشارے، کنائے اور خصوصاً علامت نگاری بلکہ واضح ہوتی علامت نگاری اختصار اور جامعیت کے پیرائے میں نہ صرف قاری کو اپنے تجربے، بلکہ اپنی تخلیقی واردات میں بھی شامل کرتی ہے۔ اگر کہانی نگار اپنی اس خوبی سے آشنا ہو جائے تو، کردار، پلاٹ، کلائمکس، اینٹی کلائمکس وغیرہ وغیرہ خود قاری کے ذہن میں پھوٹ سکتے ہیں۔ قاری خود بیج میں آسمانوں کو چھوتے ڈال پات اور زیرِ زمیں پاتال میں گم باریک جڑیں تک دیکھ سکتا ہے۔ آخر تمام افسانے گونگوں، اندھوں اور بہروں کے لیے تو نہیں لکھے جا سکتے، لہٰذا کامیاب علامت نگاری کی معراج یہ ہے کہ وہ آخر میں واضح ہو جائے۔

نیکی، سچ، قوم، تہذیب، ثقافت، عقیدے جیسی اصطلاحات کی تعریف آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ مسلسل رنگ بدلتے لفظی شعبدے، جزوقتی بے چینی یا آسودگی کے مظہر ہیں اور وقت کے بہتے دھارے پر کوئی دائمی حیثیت نہیں رکھتے۔ تہذیبیں، تاریخِ انسانی کے وجود پر ابھرنے والے پھوڑے ہیں۔ جب ان چھالوں کا گندا مواد خشک ہو جاتا ہے تو شاعر ''رُدالیوں'' کی طرح اس کا ماتم کرتے اور شہر آشوب لکھتے ہیں۔ یہ فنکاریاں اصل میں مردہ جلد (dead skin) کا رونا ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے۔ اربوں، کھربوں سالوں سے کہیں ورا۔ اس سلسلے میں خود انسان ڈائنوسار کی طرح اپنے دور کے اختتام پر ہے۔ اس کے بعد کون سی نوع اس کی جگہ لے گی؟ بعد کی انواع کے مسائل کیا ہوں گے؟ اس کرۂ ارض پر انواع کے تہذیبی معاملات کی نوعیت کیا ہوگی۔۔۔۔۔کون جانے؟

ہمارے سروں پر آسمان نہیں ہے۔ ہم خوف کے سائے میں رہنے والی مخلوق ہیں۔ جہاں ہر بات پر آنکھیں کھول کر انگلی کے اشارے سے ''نہ نہ گندی بات'' کہہ کر خاموش کرا دیا جاتا ہے۔ میں نے بہت سوچا ہے کہ آخر جنسی موضوعات پر بات کرنے میں ہم عار کیوں محسوس کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ گندگی اور غلاظت کیوں منسوب کی جاتی ہے؟ جبکہ قدیم مجسموں اور شاعری میں جنسی اعضا و اختلاط کا برملا اظہار کیا جاتا تھا۔ میری دانست میں تہذیبوں کے ارتقا میں جنس کے حوالے سے گفتگو پر پابندی اور اسے ضرورت

سے زیادہ ملفوف کرنے کا ایک ہی مقصد تھا کہ اس پر سنجیدگی سے کبھی گفتگو نہ ہو سکے اور مبادا اس کا برملا اظہار اس سے وابستہ وحشت اور درندگی کو کہیں کم نہ کردے۔ مزید ستم یہ ہوا کہ اس فطری اور سیدھے سادے جذبے کو گناہ سے آلودہ کرکے ضرورت سے زیادہ پُرکشش بنا دیا گیا۔ ان تمام پابندیوں کا مقصد سوائے لذت بڑھانے کے اور کچھ نہیں ہے۔ ورنہ دنیا میں آج بھی ایسے قبائل موجود ہیں جو ننگ دھڑنگ رہتے ہیں مگر ان میں جسمانی کشش اس درجہ نہیں ہے جیسی کہ ملفوف معاشروں میں پائی جاتی ہے۔

ادب میں جنس کو موضوع بنانا کوئی عیب نہیں ہے۔ میں جنس کو سلیقے سے بطور حربہ استعمال کرنا بھی کوئی گناہ نہیں سمجھتا، لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ جنس ایک نازک آبگینہ ہے۔ اسے ٹھیک سے نہ برت سکنا بہت بڑا جرم اور گناہِ عظیم ہے۔ نہ یہ کام پارساؤں کے بس کا ہے اور نہ perverts (کج رو) اور سفلہ صفتوں کا۔ یہ تو پل صراط پر چلنا ہے۔ جہاں صرف جسم کا توازن کام نہیں دیتا بلکہ کائناتی قوتوں کو متوازن رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں میں اپنی تحریروں سے متعلق کسی کامیابی کا دعویٰ نہیں کر رہا بلکہ اپنی افتادِ طبع کا ذکر کر رہا ہوں۔

ہماری تنقید میں ایک مسئلہ جس پر مجھے شدید اعتراض رہا، وہ یہ ہے کہ ہم ادیبوں پر موضوعاتی چھاپ لگا دیتے ہیں۔ جنسی افسانہ نگار کی چھاپ جس پر لگ گئی اب وہ کچھ بھی لکھ دے، اُس چھاپ سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ بات یہاں تک رہتی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا، اس کے بعد لفظ ''کینوس'' لگا کر بے چارے کو اتنا محدود کر دیا جاتا ہے کہ الامان۔ نقادوں کی بوئے دہن سے لتھڑے بہت سے لفظ اپنے خول میں معنی کی جگہ تعفن لیے ہوئے ہیں۔ خصوصاً ان میں لفظ ''کینوس'' تو گویا ایک عذاب ہے۔ یہ لفظ بغیر سوچے سمجھے جڑ دیا جاتا ہے اور پھر اس کی تکرار ہوتی ہے، جس کے تناظر میں باقی کے تمام موضوعات مسخ ہو جاتے ہیں۔

ہر کردار اور ہر انسان دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک ''کوک بھرا'' کھلونا ہے۔ تقدیر کا جبر، ماحول اور معاشرے کا جبر، زمانے کا جبر، نفسیات کا جبر۔ جب ہم

سب کُوک بھرے ہیں تو کوئی کردار کیسے برا ہو سکتا ہے! مجھے اپنے کرداروں کی اصلاح مقصود نہیں، نہ ان کہانیوں کا مقصد معاشرے کے اصلاح پسندوں کو جگانا اور جھنجھوڑنا ہے، نہ ہی ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو غیرت دلانا مطلوب ہے۔ مجھے ہر کردار واقعی اور مکمّل دکھائی دیتا ہے۔ نالی یا گٹر میں پیدا ہونے والا کیڑا میں نے پیدا نہیں کیا۔ نہ میں اسے وہاں سے نکال کر خوشبوؤں یا پھولوں میں رکھنے کا شائق ہوں کیوں کہ اس طرح کی کوئی بھی حرکت اس کی موت کا باعث ہوگی۔

پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ جو مجھے نظر آتا ہے، وہی سچ ہے۔ لوگ اسے جو بھی کہیں۔ بس میرے لیے وہی ''حسن'' کا درجہ رکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ خیال بھی خام ہوا۔ جب پتا چلا کہ جو نظر آتا ہے، وہ تو دھوکا ہے۔ سورج وہاں نہیں ہوتا، جہاں دکھائی دیتا ہے۔ ستارے موجود ہیں کہ کب کے ختم ہو چکے ہیں؟ حسنِ مجبوب نظر کے سکس بائی سکس کا کمال ہے۔ اسی حسن کو اگر آپ الیکٹرون مائیکروسکوپ سے دیکھنے لگیں تو نرم ملائم جلد غاروں، جھاڑیوں اور جانوروں سے بھرے جنگل سے کم دکھائی نہیں دے گی۔ اسے ہونٹوں سے چھونا تو کجا ہاتھوں سے مَس کرنے سے گِھن آئے گی۔ سو اس زاویے سے سوچا تو سب کچھ اُلجھ کر رہ گیا۔ میں تو پہلے ہی عشق کی ہر صورت کو عقل کا بگاڑ سمجھے بیٹھا تھا۔ پھر ایک عرصے تک سوچوں کی بھٹّی میں جل کر میں نے زندہ رہنے کے لیے ایک نئی حماقت کی راہ تلاش کر لی اور وہ یہ تھی کہ جو چہرہ سکس بائی سکس میں میرے لیے حسن کامل ہے۔ وہ یقیناً اس کے اُوپر رہنے والے ''حشرات الجلد'' کے لیے بھی حسن کی معراج ہوگا۔ وہ اپنے علاقے کی محبت میں اس کی حفاظت کے لیے مر مٹنے پر تیار رہتے ہوں گے۔ اس کے لیے جانوں کے نذرانے پیش کرتے ہوں گے۔ اس خیال نے مجھے بہت اطمینان دیا اور مجھ پر منکشف ہوا کہ حسن کی بے شمار پرتیں ہوتی ہیں۔ مجھے لگا کہ تہہ در تہہ حُسن کی تلاش ہی ادب کی ارفع صورت ہے۔ گندگی اور بدصورتی صرف زاویۂ نظر سے ہے۔ اسی لیے میرا کوئی کردار برا نہیں ہے اگر برا ہوتا تو میرے افسانے میں کیوں آتا۔۔۔؟

لایعنیت مایوسی نہیں ایک مکمل غور طلب مسئلہ ہے۔ جو آفرینش سے لے کر ابد تک کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جو باقاعدہ ایک ضابطہ حیات یا ضابطہ اخلاق کا متقاضی ہے۔ یہ مسئلہ آپ کے کینوس کے چاروں زاویوں سے کہیں باہر تک جاتا ہے۔ اسے نفسیاتی بیماری کہہ کر کینوس کی تنگی سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ اس بے مقصدیت کے ساتھ، کسی لالچ یا خوف کے بغیر ایک پُرامن معاشرے کے قیام کا سوال انسانیت کی معراج ہے۔ میں نے سوال کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا۔ یہ وہ سوال ہے جو تمام عصبیتوں سے بلند تر ہو کر خالصتاً حیاتیاتی بنیادوں پر سوچنے کا نام ہے۔

اس کتاب میں کچھ کہانیاں ایسی ہیں جن کی اشاعت سے مجھے احباب نے روکا تھا۔ ان کے نزدیک ابھی ہمارے معاشرے میں بہت کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ سچ کہنے سے ہی سننے اور پرکھنے کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ سو میں نے پورے خلوص سے یہ کوشش کی ہے۔ فیصلہ تو بہر حال قاری کو کرنا ہے۔

سیّد ماجد شاہ

۲۴ ستمبر ۲۰۱۵

رابطہ: 0334-5354854

گھوم رے سورج۔۔۔

''جب سورج تمہاری آنکھوں کی پتلیوں میں جذب ہو جائے گا۔۔۔ جب اس کی تیز روشنی تمہاری بینائی کے سامنے دم توڑ دے گی۔۔۔ جب وہ تمہاری جرأت کے سامنے اپنی ہستی مٹا دے گا۔۔۔تب۔۔۔اریش! تب تم اسے جو حکم دو گی، وہ مانے گا۔۔۔ وہ مجبور کر دیا جائے گا۔۔۔ اُس روز وقت لپیٹ لیا جائے گا۔۔۔ ماضی، مستقبل بن کر پھر تمہاری دسترس میں ہو گا۔۔۔ یہ تپ بہت کڑی ہے۔۔۔جان جائے گی یا مراد بر آئے گی۔۔۔اریش!'' یا آنکھیں نہیں ہیں۔۔۔ یا ماضی''۔۔۔اس نے ان آنکھوں کا کیا کرنا تھا۔

۔۔۔دن کا ایک بج رہا تھا۔۔۔

سفید کپڑوں میں ملبوس اریش صحرا کے اونچے ٹیلے پر رُک گئی۔ تیز لُو کے تھپیڑے جسم جلا رہے تھے لیکن وہ روز کی طرح بڑے اعتماد سے سورج کو دیکھنے لگی۔۔۔ بغیر پلک جھپکے۔۔۔ اسے لُو کا احساس تھا نہ نظر پر دھوپ کی شدت کا بوجھ۔۔۔

اریش ایک نقطے پر نظریں جمائے۔۔۔ ریت پر بیٹھ گئی۔۔۔ بیٹھی رہی۔۔۔ بالآخر ایک مدّت کی ریاضت رنگ لائی۔۔۔ سورج رنگ بدلنے لگا۔۔۔ زرد ہوا۔۔۔ تانبے کا تھال بنا۔۔۔ سیاہ ہوا۔۔۔ اور دھبہ بن کر غائب ہو گیا۔۔۔ اُس نے جادوگر کا سکھایا

منتر پڑھنا بند کر دیا۔۔۔اور حکم چلانے کے لیے تیار ہوگئی۔۔۔ ''میں ! اریش بنتِ سعادت، عمر اکیاون سال، جو پچھلے اکتیس سال سے رحمت وَلد کرامت کے نکاح میں ہوں۔۔۔ تجھے حکم دیتی ہوں کہ تو میرے اشارے پر اُلٹا گھوم جا۔''

اس نے سانس روک لی۔۔۔جھریوں بھرے غلاف آنکھوں پر گرا دیے۔۔۔ سلوٹیں پڑی انگلی سے سورج کو اشارہ کیا اور زیرِ لب کہنے لگی۔

''گھوم رے سورج، اُلٹا گھوم۔''

''گھوووم رے سورج، اُلٹا گھوووم۔''

اُس کی آواز میں تیزی آنے لگی۔۔۔وقت کا پہیہ رُک گیا۔۔۔سورج واپسی پر آمادہ ہو گیا۔۔۔مشرق کی طرف سرکنے لگا۔۔۔وہ دُہراتی رہی۔۔۔ ''گھوووم رے سورج، الٹا گھوووم''۔۔۔ایک ''دن'' ماضی کے دھند لکے سے باہر آ گیا۔۔۔اریش نے سورج کو رکنے کا اشارہ کیا۔۔۔وہ رک گیا۔۔۔اُس نے دماغ کے خلیوں میں جھانکا۔۔۔ وہ کل، جو ماضی تھا۔۔۔اب مستقبل بنا پوری آب وتاب کے ساتھ سانسیں لے رہا تھا۔۔۔ ''یہ ہوئی نا بات''۔۔۔ایک بار پھر دماغ کے کٹورے سے خیال انڈیل کر اُسے خالی کر دیا گیا اور کہنا شروع کیا۔۔۔ ''گھووم رے سورج، الٹا گھوم۔''

سورج مغرب سے طلوع ہو کر مشرق میں غروب ہونے لگا۔۔۔تین سو پینسٹھویں چکر پر سورج، اریش کے حکم پر رک گیا۔۔۔دماغ خیالوں سے بھر گیا۔۔۔پورا ایک سال۔۔۔جو، اب ماضی بھی تھا اور مستقبل بھی۔۔۔ہر بات اسے یاد تھی۔ پورے کرب اور دکھ کے ساتھ۔۔۔وہ خوش ہوئی۔۔۔توجہ۔۔۔یکسوئی۔۔۔ ''گھوم رے سورج، الٹا گھوم''۔۔۔شامیں، صبح ہوئی جاتی تھیں۔۔۔پیلے سوکھے پتے، سبز ہو کر تازہ کونپلیں بن کر گم ہوئے جاتے تھے۔ مرجھائے پھول، نوخیز کلیوں میں تبدیل ہوئے جاتے تھے۔۔۔وہ۔۔۔وہ بیس سال کی لڑکی بن گئی۔

اس نے خوبصورت، شہتوت کی ٹہنی سی لچکدار لانبی انگلی سے اشارہ کیا اور آگ

کا گولا رک گیا۔ مہرِ درخشاں اپنی آب و تاب پر آ گیا۔ اُس کی غلامی ختم ہوئی۔۔۔ ارلیش کا امتحان شروع ہو گیا۔

وہ اپنے کمرے میں تھی۔ ڈھولک کی آواز، وہ لرز گئی۔۔۔ اکتیس سال۔۔۔ جو اَب ماضی بھی تھے اور مستقبل بھی، دماغ کے ننھّے ننھّے خلیوں کے آئینوں میں چمک رہے تھے۔

اب وہ بیس سال کی لڑکی تھی۔۔۔ قدِ آدم آئینہ کے سامنے آئی تو خود آئینہ ہو گئی۔ سب غم و الم بھول گئی۔ ماضی، حال اور مستقبل سے بے نیاز ہو کر خود میں محو ہو گئی۔ بے ساختہ اپنے چہرے اور جسم کو چھوا تو شرما گئی۔۔۔ ڈھولک کی تھاپ نے اُسے چونکا دیا۔۔۔ وہ فکر مند ہو گئی۔۔۔ ماضی کی ایک غلطی اور اتنی سخت سزا۔۔۔ اکتیس سال۔۔۔ عمر قید کی سزا پانے والے بھی چودہ سال بند رکھے جاتے ہیں۔

اکتیس سال کا سوچ کر اُس نے جھرجھری لی۔۔۔ اب حیرت سے اس کا دل پسلیاں توڑنے لگا۔۔۔ اُس کی ساری ریاضت، اُس کا سارا تپ، اُس غلطی کو درست کرنے کے لیے تھا۔۔۔ وہ کامیاب ہوئی۔۔۔ ڈھولک کی تھاپ۔۔۔ اپنے کمرے کو دوبارہ دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اُس نے مختلف چیزوں کو چھو کر دیکھا۔

جب ذرا بحال ہوئی تو دھوپ کے ریزے تاریکی کے جاروب کی زَد میں آئے ہوئے تھے۔۔۔ ڈھولک کی مدھم تھاپ سے اُس کا دل دہل رہا تھا۔ اُس نے فوراً الماری کھولی۔ چراغ کے تیل باتی دیکھے۔ سب ٹھیک تھا۔ اُس نے چراغ اُٹھایا اور دیوانوں کی طرح کھڑکی کے پٹ کھول کر چراغ عین اُس جگہ رکھا جہاں سے وہ دور درختوں کی اَوٹ سے نظر آتا تھا۔ جہاں سے، شہزاد چاندنی پر قدم رکھتا، اَوس کی رِم جھم میں بھیگا، کمرے میں آتا تھا۔ اُس نے شہزاد کا لمس اور خوشبو محسوس کی تو۔۔۔ اچانک ذہن کے ننھّے آبگینوں میں اکتیس سال کی تلخی گھوم گئی۔ وہ بے چینی سے ٹہلنے لگی۔۔۔ اُس نے خود کو پھر سے اکٹھا کیا۔ وہ بہت ریاضت کے بعد آئی تھی۔ پوری کائنات میں صرف اسے قدرت نے یہ موقع

دیا تھا۔ ورنہ ایسا کہیں ہوتا ہے؟ کبھی سورج بھی اُلٹا گھومتا ہے؟ وہ کیسے کمزور پڑ سکتی ہے؟

وہ فیصلہ بدلنے آئی تھی۔ پہلے بھی اُس نے چراغ روشن نہیں کیا تھا۔۔۔ اور زندگی اندھیر کر لی تھی۔۔۔ اب وہ بیس سال کی بچی نہیں تھی۔ جو عشق اور عیاشی کا فرق نہ جانتی ہو۔ اُس پر وہ حقیقت منکشف ہوئی تھی جو کبھی کسی پر نہ ہوئی تھی۔ اِس بار وہ چکی میں نہیں پسے گی۔ وہ پھر الماری کی طرف پلٹی اور دیا سلائی لا کر چراغ کے ساتھ رکھ دی۔

اسے خیال آیا کے اُس رات شہزاد، کس اُمید سے، کتنی دیر تک بے نور دریچے کو تکتا رہا ہوگا۔

اچانک دروازہ کھلا اور خالہ بلقیس تیزی سے اندر داخل ہوئیں۔ اریش کی تو جان ہی نکل گئی۔ ''اری لڑکی! تو کِدھر ہے؟ چل نیچے لڑکیاں تیرا انتظار کر رہی ہیں۔''

وہ اِس طرح بات کر رہی تھیں، جیسے ابھی دس منٹ پہلے ملی ہوں جبکہ یہ انھیں ایک مدت کے بعد دیکھ رہی تھی۔ ''چل میری لاڈو! نیچے لڑکیاں انتظار کر رہی ہیں۔ چل!'' وہ تیزی سے بول رہی تھیں۔ وہ اسے نیچے لے گئیں۔ اریش رکنے کی کوشش کے باوجود اِس بھروسے پر چل دی کہ اسے کوئی واقعہ کمزور نہیں کر سکے گا۔ وہ بہت ریاضت کر کے آئی تھی۔ اُس نے وہ کیا جو کہیں نہیں ہوتا اُس نے وہ کیا جو پھر کبھی نہ ہوگا۔

گھر میں وہی گہما گہمی تھی۔ بھائی بھاگ بھاگ کے کام کر رہے ہیں۔ بہنیں نئے کپڑے سنبھالتیں اِدھر سے اُدھر دوڑتی جاتی ہیں۔ کام کاج والیاں، امّاں کے اشاروں پر روبوٹ بنی ہوئی ہیں۔ پورے منظر پر رعب اور دبدبہ اُس وقت طاری ہو جاتا تھا جب ابّا اپنی اَنا سے اونچا کلاہ پہنے، اِس منظر سے گزر جاتے تھے۔ ابّا کے سفید اُجلے کپڑوں کی بھڑک اُسے جان سے عزیز تھی۔ آج روشنی بہت تیز تھی۔ باپ کے کپڑوں سے اُٹھتی کرنوں نے اُس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ مرے ہوئے باپ کو جیتا جاگتا دیکھ کر۔۔۔ وہ نظریں چرانے لگی۔۔۔ احساسِ جرم ماتھے پر ننھی ننھی بوندوں میں چمکنے لگا۔ وہ ویسے بھی آج کچھ نہیں دیکھنا چاہتی تھی ورنہ چشمِ تخیّل اُسے رہ رہ کر شادی پر ناچتی خوشیاں اور ڈھولک پر بیٹی

کی پاک دامنی اور عزت کا ڈھنڈورا برباد ہوتا دکھا رہی تھی۔ وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ پاس سے گزرتی چھوٹی بہن، تحریم نے پوچھا، ''آپی! برتنوں والی الماری کی چابیاں کہاں ہیں؟'' اس نے بے دھیانی میں جواب دیا۔ ''امی کے بیڈ والے دراز میں''۔۔۔ بھائی پیار سے سر پر ہاتھ پھیر کر گزر گیا۔۔۔ وہ چونک گئی۔۔۔ یہ سب تو وہی ہو رہا تھا۔۔۔ جیسا اکتیس سال پہلے ہوا تھا۔۔۔ وہ غش کھا کر گرنے لگی تھی۔۔۔ بہن کی عزت، بھائی کی غیرت، آخر وہ کیوں تھی؟ باپ کی پگڑی کا کلف وہ کیوں بنے؟ وہ پرائی انا کی سولی پر اکتیس سال گزار چکی تھی۔۔۔ اکتیس سال۔۔۔ یعنی ایک پوری زندگی۔۔۔ وہ چکرا گئی۔۔۔ خالہ بلقیس سے ہاتھ چھڑا کر کمرے کی طرف چل دی۔۔۔ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اماں سے نظریں چار ہوئیں۔۔۔ اُن کی آنکھوں سے پیار کی آبشاریں پھوٹ رہی تھیں۔۔۔ موت گھوم گئی اُس کے سامنے۔۔۔ وہ جانتی تھی۔۔۔ آج کے بعد۔۔۔ یہ آبشاریں خشک ہو جائیں گی۔۔۔ اور ان پیاری آنکھوں سے، قطرہ قطرہ بد نصیبی عمر بھر ٹپکتی رہے گی۔۔۔ مستقبل۔۔۔ بھیانک مستقبل۔۔۔ جو ماضی بھی رہ چکا تھا۔۔۔ وہ بہت ریاضت کر کے آئی تھی جو کام آئی۔۔۔ ورنہ وہ اپنے قدموں پر کمرے تک نہ پہنچ سکتی۔۔۔ کمرا بند کر لیا اُس نے۔۔۔ ننھے آبگینوں میں اکتیس سالوں کی یادیں وہ اسی لیے لائی تھی کہ فیصلہ نہ بدل سکے۔ چراغ روشن ہو گا۔ آج دریچے سے نور کی کرنیں دشمنوں کے لڑکے کی آنکھیں روشن کریں گی۔۔۔ باپ کا شملہ جلتا ہے تو جلے۔۔۔ بھائیوں کی گردن میں وہ اپنی حسرتوں کا سریا نہیں ڈال سکتی تھی۔۔۔ وہ یہ جملے منتر کی طرح ورد کیے جا رہی تھی۔۔۔ لیکن خاندان کی محبت کچھ اور تصویریں دکھانے لگی تھی۔۔۔ اُس نے باپ کو ننگے سر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُونچے کلاہ کے بغیر باپ کیسا کمین لگے گا۔۔۔ ماں۔۔۔ بھائی۔۔۔ بہن۔۔۔ چھوٹی۔۔۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا۔۔۔ وہ ورد تیزی سے کرنے لگی تھی۔۔۔ وہ عزت، غیرت کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔۔۔ درجنوں لوگوں کے قاتل کو ایک بار سزائے موت ہوتی ہے۔ اسے دو بار کیوں؟؟ قدرت صرف اُس پر مہربان ہوئی تھی۔۔۔ سورج کہاں کسی کے کہنے پر گھوما

تھا۔۔۔نہیں۔۔۔اب فیصلہ۔۔۔ وہ نہیں ہو گا۔۔ اس نے کچھ اچھا سوچنے کی کوشش کی۔۔۔شہزاد کا چہرہ۔۔۔جس کی ریاضت وقت اُلٹا چکی تھی۔۔۔اُس کے سامنے تصویر گھومنے لگی۔۔۔چاند میں اُس کے چہرے کی روشنی تھی۔۔۔ستاروں میں اُس کی آنکھوں کی چمک تھی۔۔۔پھولوں میں اُس کے رنگ۔۔۔پھلوں میں اُس کی مٹھاس۔۔۔کانٹوں میں اُس کا تیکھا پن۔۔۔اندھیروں میں اُس کی آنکھوں کی کالک۔۔۔کھیتوں میں اُسی کی لہک۔۔۔نہروں میں اُسی کی روانی۔۔۔پہاڑوں میں اُسی کے ارادے۔۔۔وہ۔۔۔وہ لڑکا نہیں تھا۔۔۔پوری کائنات سمٹ کر آ گئی تھی اُس میں یا بکھر کر، وہ خود کائنات ہو گیا تھا۔۔۔چراغ جلنے پر آتا تھا۔۔۔دریچے کی چرمراہٹ کے بغیر۔۔۔اندھیرے کی چادر اوڑھے، چراغ کی کرنوں پر قدم رکھتا۔۔۔وہ کیسا وقت کا شہسوار تھا۔۔۔ایک چابک لگاتا اور ہم لمحوں میں صبح کی دہلیز پر پہنچ جاتے۔۔۔اُس کے جاتے ہی گھڑیاں پولیو زدہ ہو جاتی تھیں۔

اُس نے سوچا اکتیس سال پہلے وہ درختوں کی اوٹ سے دیکھتا رہا ہو گا۔۔۔ تڑپتا۔۔۔کسمساتا۔۔۔گالیاں بکتا رہا ہو گا۔۔۔کمینہ کیسی ننگی گالیاں بکتا تھا۔۔۔وہ خود سے شرما گئی۔۔۔وہ رات اُس پر کتنی بھاری گزری ہو گی۔۔۔وہ کہا کرتا تھا ”میری سانسوں کی ڈوری، تیرے دریچے کی کرنوں سے بندھی ہے“۔۔۔وہ زندہ رہا؟ مر گیا تھا؟۔۔۔وہ تو دریچے کی تاریکی اوڑھ کر میرے اکتیس سال اپنی بُکل میں لپیٹ کر کہیں لے گیا تھا۔۔۔ اُس رات دریچہ روشن نہ کر کے اُس نے اپنی زندگی تیل باتی سے محروم کر لی تھی۔۔۔وہ کہاں چلا گیا تھا۔۔۔دشمنوں کے لڑکے کی خبر تو بادِ صبا بھی نہیں لایا کرتی۔۔۔اُس نے سوچا بن خوشبو لگائے۔۔۔اُس سے کیسی خوشگوار، تیز اور گرم خوشبو آتی تھی۔۔۔خوشبو کے جھونکے۔۔۔اچانک اسے تلخ ماضی کی طرف لے گئے جو اَب مستقبل بھی تھا۔۔۔شوہر ۔۔۔جلاد۔۔۔بدشکل۔۔۔بدشکل شوہر برداشت کر لیا جاتا ہے۔۔۔پر اُس کے شوہر میں کرختگی اور بدصورتی ہڈیوں کے گودے سے رُوح کی پنہائیوں تک شامل تھی۔۔۔بعض

لوگوں کو شاید مٹی سے نہیں بنایا جاتا۔۔۔ساس، نندیں۔۔۔پھر۔۔۔رکھیلیں۔۔۔سوکنیں ۔۔۔اس کی آنکھوں میں چھلک آئیں۔۔۔اس نے آنسو اِس بے دردی سے صاف کر کے جھٹکے۔۔۔جیسے سب کو زمین پر پٹخ دیا ہو۔۔۔وہ آئی بھی سب کو پٹخنے اور نیچا دکھانے تھی۔

حُسن، پجاری سے ہوتا ہے۔ وہاں وہ داسیوں سے بدتر تھی۔ اُس کا پجاری سامنے درختوں کی اوٹ میں تھا۔۔۔اکتیس سال کی آگ میں جل کر اُس پر انکشاف ہوا تھا۔۔۔ ہر انسان خود حُسن کا خدا ہوتا ہے۔۔۔لیکن صرف کسی ایک پجاری کے لیے۔۔۔ پرستار، جز وقتی جنونی اور ٹشو پیپر کی ذہنیت والے لاکھوں تلوے چاٹتے پھرتے ہیں۔ مصیبت یہی ہے کہ اُس واحد عبادت گزار کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔۔۔وہ نہ ملے۔۔۔مر جائے۔۔۔ شک کی چادر اوڑھ لے، تو بد نصیبوں کو جنگلوں، صحراؤں میں کھپنا پڑتا ہے۔۔۔آگ میں جلنا پڑتا ہے۔۔۔وہم باہر بُت تراشتا ہے۔۔۔سجدے کرواتا ہے۔۔۔سنگلاخ زمینوں پر ماتھے گھسواتا ہے۔۔۔سیاہی ملتا ہے۔۔۔ پر کچھ ہاتھ نہیں آتا۔۔۔کتنی عجیب بات تھی۔۔۔پجاری کی وحدت۔۔۔نہ کہیں سنی نہ دیکھی۔۔۔اپنے اندر، کامل حُسن کے دیوتا کی تسکین کے لیے۔۔۔یہ باتیں لوگوں کے لیے عجیب تھیں۔ اریش پر یہ عقدہ کھل چکا تھا۔ وہ توحید کی قائل ہو کر آئی تھی اور یہ توحید پجاری کی توحید تھی۔ وہ فیصلہ کیسے بدل سکتی تھی؟؟؟۔۔۔منتر ویسے تو کارگر نہیں ہوا تھا۔۔۔ ''گھوم رے سورج اُلٹا گھوم'' ۔۔۔اور وہ گھوما تھا۔۔۔وہ ریاضت کر کے آئی تھی۔۔۔اکتیس سال۔۔۔ جہاں ایک پَل، سوئی بن کر خلیہ خلیہ اُس میں پروتا تھا۔۔۔اب نہیں۔۔۔ وہ جلدی سے کھڑکی کی طرف لپکی۔۔۔اُس نے کانپتے ہاتھوں سے دیا سلائی جلائی۔۔۔وہ نہیں جلی۔۔۔تیزی سے دوسری جلائی، جلتی تیلی ہاتھ سے گر گئی۔۔۔ ماں باپ بہن بھائی۔۔۔اندر حُسنِ کامل کی طلب۔۔۔وہ کیوں آئی تھی واپس؟؟؟ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ

اتنا روئے، اتنا روئے کہ اپنی آنکھوں کے پانی میں ڈوب کر مر جائے۔۔۔خود پر جبر کر کے اُس نے چراغ روشن کر دیا۔۔۔کرنیں دریچے سے درختوں کی اوٹ میں جاتی

رہیں۔۔۔ جاتی رہیں۔۔۔وہ کھڑکی سے سر ٹیک کر بیٹھ گئی۔۔۔ پتوں میں سرسراہٹ ہوئی تو اُس نے خوشی آمیز بے چینی سے دیکھا۔۔۔ ہوا چل پڑی تھی۔ تیز ہوا میں چراغ جل رہا تھا۔۔۔ہوا اُس کے گھنیرے بالوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگی۔ ہونٹوں، گالوں اور کانوں سے بال مَس ہونے لگے۔۔۔اسے خوشگوار احساس ہوا۔۔۔شہزاد۔۔۔؟ ہوا تیز تھی، چراغ جل رہا تھا۔۔۔ چراغ کی کرنوں پر آج تیرگی کے ناگ کمرے میں داخل ہو تے رہے۔۔۔ پر اُس کا عزم آہنی تھا۔

اکتیس سال کے عذاب جتنا بوجھ اُٹھائے۔۔۔رات گزر گئی۔۔۔ جب صبح اُسے، اُسی بدصورت کی ڈولی میں بٹھایا جا رہا تھا تو اُس نے سورج کو اِس حقارت سے دیکھا، جیسے وہ ایک بار پھر اُسے گھمانے کی جرأت رکھتی ہو۔

میں ہوں تو میرا سایہ بھی ہے

''تمہارا سایہ!'' اس کی آواز پر میں نے ہانپتے ہوئے پسینے سے شرابور پلکوں کو جنبش دی، قطرے جھڑے تو نظریں گھما کر دیکھا، واقعی کچھ گڑ بڑ تھی۔ پر تھکاوٹ نے سوچنے کی مہلت نہ دی۔ میں چلتا چلا گیا۔

اگلے دن سفر سے پیشتر میرِ کارواں نے مدلل اور جوشیلے انداز میں منزل کی مسافت یوں بیان کی کہ پہاڑ رائی، میل اور فرسنگ بالشت سے کم نظر آنے لگے۔ اس کے تیز الفاظ درانتیاں اور آریاں بن گئے۔ جھاڑیاں، کانٹے سب ختم ہو گئے۔ راستہ ہموار تھا یا نہیں ہمیں ہموار لگنے لگا تھا۔ ہم چل پڑے۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے ہمارے سر پر آسمان وہی ہے جو کہ تھا یعنی ہم سب وہیں کھڑے زمین کو پاؤں سے گھماتے چلے جا رہے ہیں اور منزل دوسروں سے سرکتی ہوئی ہمارے قریب آ رہی ہے۔

جب سے مشقت کا یہ دور شروع ہوا تھا۔ مجھے روشنی سے نفرت ہو گئی تھی، صبح زہر لگنے لگی تھی۔ زیادہ اذیت اس وقت ہوتی جب یہ کم بخت سورج طلوع ہو رہا ہوتا۔ تازہ کرنوں کے نیزے میری آنکھیں چیر ڈالتے تھے۔ پپوٹوں کے نرم غلاف جب روشنی نہ روک پاتے تو میں ہاتھ کی اوٹ لیتا۔ انگلیوں کی درزیں کرنوں کی انی کو اور آب دیتی تھیں۔ میری بینائی چھلنی ہو گئی تھی۔

چلتے چلتے میری نظر اپنے سائے پر پڑی۔ ''کچھ گڑبڑ ہے'' میں نے سوچا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرا سایہ میرے قد کو چھونے لگا تھا۔ ہم سفروں کے سائے ایسے منہ زور نہ تھے۔ میرِ کارواں نے تو سائے کو یوں پاؤں تلے دبا رکھا تھا کہ وہ بے چارہ سانس بھی نہ لے سکتا تھا۔

سایہ میرا عارضہ بن گیا۔ میرِ کارواں کا جوشِ خطابت مدّھم ہو کر بے اثر ہو گیا۔ منزل دھندلا گئی۔ اِردگرد بے نیازی کے گھنگھور اندھیرے چھا گئے۔ میں اور میرا سایہ دونوں اُلجھ کر رہ گئے۔ رقیبوں کی طرح میں اس پر نظر رکھنے لگا۔ میں چاہتا تھا۔ وہ اپنی حد میں رہے لیکن وہ میرے قد سے کہیں بڑھ گیا۔ چند ہی دنوں میں اس نے خاصا قد نکال لیا۔

وہ میرا سایہ تھا، اسے میرے قد سے نسبت ہونی چاہیے تھی۔ میں نے دوسروں کو دیکھنا شروع کر دیا کہ وہ اس خبیث کو کیسے دبا کر رکھتے ہیں؟ مشاہدہ شروع ہوا۔ لوگوں کو پرکھا، سایوں کا ماپ تول کیا، بات کچھ کچھ سمجھ آنا شروع ہوئی۔ اچانک خیال آیا کیوں نہ لگے ہاتھوں میرِ کارواں کا جائزہ لے لیا جائے۔ میں بھاگتا دوڑتا اس کے قریب جا پہنچا۔ دیکھا۔ ''اوہو! تو یہ مسئلہ تھا۔ یار! میں بھی کتنا احمق ہوں۔'' میں نے سرگوشی کے انداز میں خود کلامی کی، ''مسئلے کا حل مل گیا۔ میرِ کارواں سورج کو عین سر پر رکھتا تھا اور سورج کی رفتار سے قدم ملا کر چلتا تھا۔ اسی لیے یہ بے حقیقت مخلوق، یہ سائے وائے اس کے تلوے چاٹتے تھے۔ کم بخت اس کے پیروں تلے سانس بھی نہ لے پاتے تھے۔ میں نے تو سائے کو سر چڑھا لیا تھا۔ یہ سائے تو وہم ہوتے ہیں۔ یہ آپ کے جسم کا عضو نہیں ہیں۔ یہ اضافی ہیں، یہ کچھ بھی نہیں ہوتے۔'' میں نے خود کو ڈھیروں تسلّیوں تلے چھپا لیا۔

بات سمجھ میں آئی تو اگلے روز میں میرِ کارواں کے نقشِ قدم پر یوں پاؤں رکھتا تھا کہ ایڑی پر ایڑی اور پنجے پر پنجہ آئے۔ میں نے حیرانی سے دیکھا، میرے پاؤں رکھنے سے اس کے تلوے کا نقش تک خراب نہ ہوتا تھا۔ ہم دونوں کے پاؤں کا ماپ ایک تھا، قد کی طرح۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کوئی مٹی پر نقش دیکھ کر یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہاں

دو لوگوں نے قدم رکھے ہیں۔ میں میرِ کارواں سے نسبت اور تناسب قائم کرنے میں منہمک تھا کہ میرِ کارواں نے بار بار مڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر حفاظتی دستے سے مخاطب ہوا، ''پتا کرو! یہ کون ہے؟'' مجھے زندگی کے لالے پڑ گئے۔ وہ ایسے ایسے زاویوں سے گھورنے لگے کہ میں اپنوں میں اجنبی ہو کر رہ گیا۔

میرِ کارواں ایک سو اسی کے زاویے پر گھوما تو ہم دونوں آمنے سامنے تھے۔ پھر اس نے مجھے قافلہ بدر کرنے کا حکم سنایا۔ میں نے التجا کی ''حضور! یہ تو موت کا حکم ہے۔ میں ان ویرانوں میں تنہا، کہاں بھٹکتا پھروں گا؟ رحم کیجیے! میرا قصور کیا ہے؟ میرے آقا!''۔۔۔ ''اپنا سایہ دیکھو!'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں نے غور کیا میرا سایہ میرِ کارواں کے اوپر سے ہوتا ہوا کہیں آگے، منزل کے بہت قریب تھا۔ میں نے کہا، ''جہاں پناہ! یہ سایہ ہے۔ سایہ وہم ہوتا ہے۔ یہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ میری وجہ سے ہے۔ یہ میرے جسم کا حصہ نہیں ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں، میں ہوں تو یہ بھی ہے۔ آپ۔۔۔'' میرِ کارواں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے چپ رہنے کو کہا اور غصے سے بولا، ''کیا کہا!!! یہ کچھ نہیں؟'' پھر سائے کو دیکھ کر چلایا، ''بہت خوب! تو اب یہ ہم سے پہلے منزل پر پہنچے گا؟'' پھر حفاظتی دستے کو معنی خیز انداز میں مخاطب کیا، ''یہ ٹھیک کہتا ہے۔۔۔ یہ ہے۔۔۔ تو اس کا سایہ بھی ہے۔''

انتہائی گھٹیا آدمی۔۔۔؟

میں کالج سے کوئی ڈیڑھ بجے واپس آیا۔ اس وقت چاروں کمرے ویران تھے۔ میں سو گیا۔ جب اٹھا اور ہاتھ منہ دھونے کمرے سے باہر گیا تو اچانک میں نے دیکھا تیسری منزل کی چھت سے وہی سفید رنگت اور بھورے بالوں والا لڑکا ہمارے سامنے والے کمروں کی چھت پر بڑے انہماک سے کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ گھبرا کر چھپ گیا۔ اسی اثنا میں عقب سے کوّے نے پھڑ پھڑاتے ہوئے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے ہاتھ کی اوٹ بنا کر اس سے بچنے کی کوشش کی اور سامنے والے کمرے کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کوّا فضا میں بلند ہوا اور دوبارہ ہمارے کمرے کی چھت پر بیٹھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کائیں کائیں کرنے لگا۔ جب میں صحن میں ہاتھ منہ دھو رہا تھا تو ہمارے کمرے کی دیوار پر سایہ نمودار ہوا۔ کوّا اُڑ گیا۔ میں نے غصے سے دل ہی دل میں کہا، "یہ ملک عرفان انتہائی گھٹیا آدمی ہے۔ پتا نہیں یہ چھپ کر وہاں کیا تماشا رچاتا ہے۔ جسے وہ خبیث لڑکا ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہے۔"

یہ بات 1996ء کی ہے۔ جب میں نیا نیا اسلام آباد میں لیکچرار بھرتی ہوا تھا۔ شہر بدلنے سے میرے اندر کی گھٹن کچھ کم ہو گئی تھی۔ میرے لیے ایک ہی علاقے میں طویل

عرصہ رہنا انتہائی تکلیف دہ تھا۔ یکسانیت سوہانِ روح ہوئی جاتی تھی۔ ایبٹ آباد سے اسلام آباد آکر میری سانسوں میں روانی آگئی تھی۔ منظر بدل گئے۔ لوگ، لہجے سب نیا۔۔۔ مجھے لگتا تھا۔ جیسے صدیوں کی یکسانیت ٹوٹ گئی ہو لیکن یہاں آکر رہائش کا مسئلہ مجھے خاصا تنگ کر رہا تھا۔ دو تین گھر بدلنے کے باوجود پاؤں کا چکر ختم نہیں ہو رہا تھا۔ میں سارا سارا دن سستی رہائش ڈھونڈنے کے لیے بری امام، کراچی کمپنی، لال مسجد کے سامنے نیچی چھتوں والے ڈربوں اور فیض آباد کے قرب و جوار میں گھومتا رہتا تھا کہ اس غلیظ خانے میں جا پھنسا۔

یہاں کا پتا مجھے دانیال نے فون پر سمجھایا تھا اور کہا تھا کہ ڈھوک کالا خان میں ملک عرفان سے مل لو۔ جگہ تو کچھ اتنی اچھی نہیں ہے لیکن بندہ ہیرا ہے ہیرا۔ ملنسار، غریب پرور، نمازی، پرہیزگار، معاملات میں کھرا۔ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ سو میں رٹے رٹائے اَن دیکھے راستے پر چل پڑا۔

پہلے .D.P.S پھر ڈھوک کالا خان مین بازار پھر تنگ گلی، دونوں طرف گندی نالیاں، بدبو۔ پھر وہ بھوت بنگلہ۔ دروازے سے بائیں طرف سیڑھیاں۔ اوپر بیس فٹ کا صحن آمنے سامنے دو دو کمرے۔ سامنے بائیں والا ملک عرفان کا کمرا۔

ان سے ملیے یہ ہیں ملک عرفان۔ سر پر سفید ٹوپی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، ان پر موٹے شیشوں والی عینک، پچکے گال، پھیلی ہوئی ناک، ضرورت سے زیادہ باہر کو نکلے ہونٹ، دانتوں میں درزیں، لمبی ڈاڑھی سفید شلوار قمیض، پرانے ٹوٹے ہوئے چپل۔ آپ محکمہ تعلیمات میں کلرک ہیں۔ حکمت کی کتابیں پڑھ پڑھ کر نیم حکیم ہیں۔ اب کمرا بھی دیکھ لیجیے۔ چھت مکڑی کے سیاہ جالوں سے بھری ہوئی، کارنس پر کچھ کتابیں، دو چار برتن، کچھ دوائیوں کی شیشیاں۔ جو چیز دو چار دن پہلے استعمال ہوئی ہے وہ گرد پر رکھی ہے۔ جو استعمال نہیں ہوئی اس پر گرد جمی ہے۔ تین چار پائیاں، ایک ان کی اپنی، ایک کرایہ پر مجھے دیں گے۔ تیسری بطور مہمان خانہ استعمال ہوگی۔ ایک طرف میلا کچیلا صندوق، اس پر

پانی کا کولر، اس کے نیچے ٹپ ٹپ قطرے وصولتا گھی کا ڈبہ، ساتھ تپائی اُس پر میلا چیکٹ پلاسٹک کا گلاس۔ دوسری طرف تیل کا چولہا، ایک ٹوکری میں چند دانے آلو پیاز، ایک چنگیر اس میں روٹی کے ٹکڑے، ایک عدد چوکی اس پر دو پلیٹیں کھڑکی کی تھڑی پر چار پیالیاں، چارپائی کے نیچے بوٹ چپلوں کا ذخیرہ، بوٹ پالش کی پانچ چھ ڈبیاں، ایک عدد گنجا برش جس کے دونوں سروں پر چند بال۔

اب اگر آپ یہاں تک آہی چکے ہیں تو پورے گھر کا منظر بھی دیکھ لیں۔

اس کمبخت کمرے کے سامنے اشفاق شٹرنگ والے کا کمرہ۔ جس کی دیوار کے ساتھ واحد پانی کا نل۔ نہانا ہو تو صابن، تولیے کے علاوہ تین چار پائیاں بھی ضرورت پڑتی ہیں۔ غسل خانہ دوسری منزل کی چھت پر ممٹی کے ساتھ۔ اس کا حال مت پوچھیے اور ہاں اسی چھت سے ملی مالک مکان کی تیسری منزل، جہاں سے لڑکا نیچے اس چھت پر گھورتا ہے۔

جب میں یہ گھر دیکھ چکا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا، ''کیا میں یہاں رہ سکتا ہوں؟'' میں جو چاروں طرف پہاڑوں سے گھری خوبصورت ''وادیٔ رش'' کا باسی ہوں۔ جہاں کی ہوا پاکیزہ ہے۔ جہاں چیڑ اور چنار کے درخت ہیں۔ جہاں نیلا خود آسمان اتنا قریب ہے کہ ہاتھ بلند کرو تو چاند کو چھو لو ذرا توجہ سے سنو تو عرش کی سرگوشیاں کانوں میں گدگدی کرنے لگیں۔

میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ اندر سے یکسانیت نے سانسوں کی ڈوری کو کھینچتے ہوئے کہا، ''چند دن گزار لے آگے بہتر ہو جائے گا۔'' میرا ایمان ہے کہ اگر آپ مصیبت کے دنوں کو چند مختصر ٹکڑوں میں تقسیم کر لیں تو وہ بہت جلد گزر جاتے ہیں۔ میں نے خود سے کہا، ''آج ہے دس تاریخ، مہینہ ہے اکتیس کا دن بچے اکیس، یعنی تین ہفتے۔ ان میں ہوئے۔ تین جمعے (تب چھٹی جمعہ کو ہوتی تھی) باقی رہ گئے انیس دن۔'' سو میں وہاں رہنے لگا۔

اگلے دن میں اپنا قلندرانہ سامان، ایک بستر اور بریف کیس، لیے یہاں آگھسا اور یہ انوکھا ڈراما دیکھا۔ لڑکا مجھے دیکھ کر ایک دم چھپ گیا۔ کوّے نے حملہ کیا تو میں ہاتھ کی اوٹ بنا کر بھاگا۔ اشفاق شٹرنگ والے کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ کوّا دوبارہ چھت پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرنے لگا اور ہمارے کمرے کی دیوار پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ جو شاید یہ دیکھنے آیا تھا کہ نیچے کون ہے؟ میں نے اوپر دیکھا تو ملک عرفان، جو کچھ بوکھلایا ہوا تھا جیسے کچھ غلط کر کے آیا ہو۔

دوسرے دن جب میں رات کو دیر سے واپس آیا تو کمرے میں چھ سات لوگ بیٹھے تھے۔ ملک عرفان میرِ مجلس بنا تقریر کے جوہر دکھا رہا تھا۔ یہاں کی یہی ریت تھی۔ سب کھانا کھا کے ملک عرفان کے پاس بیٹھ جاتے تھے۔ چائے کا دور چلتا تھا۔ ملک صاحب حکمت، مذہب، سیاست پر گفتگو فرماتے اور سب فیض یاب ہوتے تھے۔ اس محفل میں آنے والے چپڑاسی اور کلرک وغیرہ کم پڑھے لکھے لوگ تھے جو ملک عرفان کو دیوتا سمجھتے تھے۔ اس کے آگے جوتیاں سیدھی کرتے، اور پیٹھ پیچھے اس کی شرافت اور دیانت کے گن گاتے تھے۔ ابھی محفل جاری تھی کہ وہی سفید رنگت اور سنہرے بالوں والا لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ جب اس نے دوست محمد سے کرایہ مانگا تو مجھے پتا چلا کہ یہ مالک مکان کا بیٹا ہے۔ وہ کچھ دیر وہاں رکا اور پیسے لے کر چلا گیا۔ اس دوران میں ملک عرفان کو دیکھتا رہا۔ وہ آفتاب عالم تاب جو ابھی علم و حکمت کے نور سے سب کو منور کر رہا تھا۔ گہن زدہ ہو کر پاؤں کے انگوٹھوں سے چپل اُلٹے سیدھے کرتا رہا۔ جب لڑکا گیا تب حضرت کی آنکھیں زمین سے اُوپر اُٹھیں۔ مجھے شک ہوا کہ اسے کوئی ایسی ویسی بیماری ہے۔ لیکن لڑکا تیسری چھت پر ملک دوسری چھت پر یہ سب میری سمجھ سے باہر تھا۔

یہ معمّا میرے دماغ میں اُلجھ کر رہ گیا۔ آخر یہاں کیا ہوتا ہے؟ میں نے لاکھ کوشش کی، خود کو سمجھایا بھی کہ مجھے ان دونوں سے کیا لینا دینا۔ وہ جانیں ان کا کام لیکن پھر کوئی واقعہ ایسا ہو جاتا کہ اس معمّے کی کیل میرے دماغ میں کچھ اور گڑ جاتی تھی۔

دوسرے تیسرے روز میں اور ملک شام کو کسی کام سے باہر نکلے۔ وہ لڑکا ہمیں گلی میں مل گیا۔ دو روز سے پانی کا پائپ خراب تھا۔ اس نے بتایا کل پلمبر آکر ٹھیک کر جائے گا۔ میں ان دونوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ تین چار جملوں کا تبادلہ ہوا اور ہم چل دیئے لیکن اس دوران وہ لڑکا بڑے اعتماد سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتا رہا مگر ملک کی نظریں زمین پر گر گئیں اور زبان ہکلانے لگی۔

مجھے ملک عرفان سے گھن آنا شروع ہو گئی۔ نظریں جھکانے کا مطلب، توبہ توبہ! تو کیا ملک۔۔۔؟ مجھے اس کی شکل ہیجڑوں کی طرح لگنے لگی۔ کوئی بات کرتے ہوئے جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس کے ہونٹوں پر سرخی لگی ہے لیکن جب میں نے غور کیا تو اس کے بھدے ہونٹوں کی سرخی، سفید رنگت اور بھورے بالوں والے لڑکے کی طرح غائب ہو گئی۔ اب میرا شک یقین میں بدل گیا کہ ملک عرفان بیمار ہے۔

میں اس سے ڈرنے لگا تھا کہ کہیں وہ مجھ سے کوئی ایسی ویسی فرمائش نہ کر بیٹھے۔ مجھے رات رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ ملک کروٹ بدلتا تو چارپائی کی چرچراہٹ سے جیسے کوا پھڑ پھڑا جاتا، میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا، پھر دیواروں پر سایہ نمودار ہو کر ہیجڑوں کی طرح بھنگڑے ڈالتا اور بے ہودہ اشاروں سے مجھے اپنے قریب بلاتا۔ ساری ساری رات یہی آنکھ مچولی ہوتی۔

صبح اکثر دیر ہو جاتی۔ میں بھاگتے دوڑتے تیار ہوتا لیکن یہ قصہ میرے دماغ میں کچھ اس طرح پھنسا ہوا تھا کہ جتنی بھی جلدی ہو خود بخود میری نظر تیسری منزل پر جاتی تھی۔ کوا ہو نہ ہو میں ہاتھ کی اوٹ بناتا تھا اور سیڑھیاں اترتے ہوئے میری نظر خود بخود کمرے کی دیوار پر جاتی تھی جہاں سایہ نمودار ہوتا تھا۔

یہ واقعہ میری نفسیاتی بیماری بن گیا تھا۔ کوئی چوری ہو رہی تھی مگر ملک دوسری منزل کی چھت پر لڑکا تیسری منزل پر میں جانتا تھا کہ کوے کا اس معاملے سے کوئی تعلق

نہیں تھا لیکن وہ اس کہانی میں ایسا گڈمڈ ہو گیا تھا کہ انہی دونوں کا ہم راز لگتا تھا۔

کہنا تو نہیں چاہیے لیکن شروع دن سے مجھے ملک سے گھن آتی تھی۔ اب اس کی شدت میں خوف کا اضافہ ہو گیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے۔ میں روٹی پہلے اٹھا لیتا تھا کہ کہیں ملک نہ چھو لے۔ جب وہ پانی پی رہا ہوتا تو میں گلاس کو دیکھتا رہتا کہ اس نے کس جگہ ہونٹ مس کیے ہیں تاکہ میں دوسری جگہ سے پانی پی سکوں۔ ویسے بھی میں اس کے گلاس میں شدید پیاس لگنے پر پانی پیتا تھا۔ وہ بھی ایسے جیسے کڑوی دوا لی جاتی ہے۔

دو تین دن میں میری حالت غیر ہو گئی۔ رات بھر کبھی میں خود کو کوّے کے حملوں سے بچاتا کبھی ہیجڑے کے بے ہودہ اشارے میری نیند اُڑا دیتے۔ اب تو نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ کالج میں پڑھاتے ہوئے، دوسروں سے باتیں کرتے، کھاتے پیتے، آتے جاتے اچانک کوا پھڑ پھڑاتا اور میں ڈر جاتا۔ سائے کے خوف سے میں نے دوبارہ نئے ٹھکانے کی تلاش شروع کر دی تھی۔ پھر بری امام، کراچی کمپنی، لال مسجد وغیرہ وغیرہ۔

آخر پروفیسر شفیق صاحب کام آئے، مجھے کمرا مل گیا۔ میری نفسیاتی الجھن کا علاج۔

میں نے کمرہ دیکھا نہ کرایہ طے کیا بس کالج میں بیٹھے بیٹھے نئے کمرے کا پتا لیا اور فیصلہ کر لیا کہ میں آج ہی رات نئے کمرے میں منتقل ہو جاؤں گا۔

ابھی اکیس دن ختم ہونے میں ڈھیروں دن باقی تھے لیکن میں خوشی خوشی واپس آیا سامان سمیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور دانیال میاں مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ ہم گرمجوشی سے ملے حال احوال پوچھا اس نے چھوٹتے ہی کہا، ''یہ جگہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے لیکن یہ بتاؤ ہمارا یار کیسا ہے؟ ہے نا ہیرا؟'' اس سے پہلے کہ میں ملک کے بارے میں کچھ کہتا، دانیال نے ملک کی تعریفیں شروع کر دیں اور ایک ہی سانس میں اس راکشس کو دیوتا بنا دیا۔ میں چپ ہو گیا۔ اس نے مجھے خاموش دیکھ کر

ملک عرفان کی پوری داستان سنانی شروع کردی۔ اس نے بتایا کہ کیسے بے چارہ اپنے پچکے گالوں اور موٹے اُبھرے ہونٹوں اور عینک کی وجہ سے پڑھ نہ سکا۔ سکول کے بچے تو کجا، گاؤں کے لونڈے اسے چھیڑتے تھے۔ پھر دانیال نے اس کے احساسِ کمتری کے قصے سنائے۔ ملک عرفان کی ماں کی بے چارگی پر اشک بہائے کہ جب بھی وہ اس کا رشتہ لے کر کسی کے گھر گئی تو اسے کیسی کیسی باتیں سننا پڑیں۔ پھر اس نے بہت مایوسی سے کہا، ''آج کل شرافت کو کون پوچھتا ہے؟'' اتنی طویل تقریر سن کر مجھے ملک سے کچھ کچھ ہمدردی ہوگئی تھی لیکن شریف النفس ہونے پر اعتراض قائم تھا۔ بہر حال میں اور دانیال بازار چلے گئے وہ وہیں سے رُخصت ہوا، میں سامان اٹھانے واپس آیا۔ ابھی میں سیڑھیاں چڑھنے ہی لگا تھا کہ اوپر مجھے دو سائے نظر آئے۔ میں رک گیا۔

ملک عرفان لڑکے سے کہہ رہا تھا، ''چار بجے چھت پر آنا۔''

''نہیں میں اب کبھی نہیں آؤں گا۔'' لڑکے نے کہا۔ ''یہ لے دس روپے، زیادہ شوخا نہ بن، تو نے کرنا ہی کیا ہے۔ صرف کھڑا ہی تو ہونا ہے۔'' ملک نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں اب میں کچھ نہیں دیکھوں گا۔'' لڑکے نے نوٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ملک نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور لڑکے کی طرف پیسے بڑھا کر غصے سے کہا، ''زیادہ بکواس نہ کر پکڑ اور پیسے، کوئی آنے والا ہے جا ادھر سے۔''

لڑکا پیسے لے کر چلا گیا۔ میرا تجسّس تناور درخت بن گیا۔ میں نے سب سے الوداعی ملاقات کی، سامان اُٹھایا اور چل دیا۔ یہ طے تھا کہ کل چار بجے میں یہ چوری پکڑ لوں گا۔ مجھے نئی جگہ پر عموماً نیند نہیں آتی لیکن میں نے اپنے نئے ٹھکانے پر پُرسکون نیند کے مزے لیے دوسرے دن میں نے کوئی لاکھ دفعہ گھڑی دیکھی۔ گھڑی معمول سے کہیں آہستہ وقت کو چار بجے کی طرف دھکیل رہی تھی۔

چار بجے تو میں دبے پاؤں سیڑھیوں سے اوپر گیا ممٹی کی جالیوں سے دیکھا تو تیسری منزل پر لڑکا موجود تھا اور ممٹی کے ایک کونے کو گھور رہا تھا۔ میں بہت احتیاط سے

دو تین سیڑھیاں اور چڑھا تو مجھے ملک عرفان نظر آیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے، منہ میں قمیص کا دامن دبائے، بالکل بے حس و حرکت نیم دراز تھا۔ شلوار گھٹنوں تک۔ اس کے ہاتھ ساکن تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نشے سے مخمور آنکھیں کھول کر لڑکے کو دیکھ لیتا تھا۔

اس حالت میں ملک مجھے بہت بدھو، معصوم اور لاچار دکھائی دیا۔ یہ سب کچھ اتنا مضحکہ خیز تھا کہ میں بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکا میں جب دبے پاؤں واپس ہو رہا تھا تو میں نے کمرے کی چھت پر دیکھا وہاں خلاف معمول کوے کی جگہ ایک سفید کبوتر بیٹھا۔ چونچ سے اپنے ملائم پر صاف کر رہا تھا۔

آنکھ کے اندھے۔۔۔

اس دن سورج معمول کے مطابق غروب ہوا تھا اور رات نے اپنے کہنہ راستے پر دھیرے دھیرے سرکنا شروع کر دیا تھا۔ چاند روشن ہو گیا تھا۔ سب کچھ اس طرح معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ جیسے صدیوں سے ہوتا آیا تھا۔ کچھ انوکھا نہیں ہے۔۔۔ کچھ نیا نہیں۔۔۔ کسے خبر تھی کہ آج ''معمول'' کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

تنویر کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ کوئی آدھی رات گزرنے کے بعد وہ بستر پر لیٹا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کافی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر تنگ آ کر اُٹھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

تنویر کا گھر پہاڑ کے دامن میں تھا۔ وہ باہر نکلا اور ذرا اونچائی پر ایک چیڑ کے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چاند روشن تھا۔ ''وادیٔ رش'' لطیف چاندنی میں لپٹی گہری نیند سو رہی تھی۔ ہر طرف بے پناہ حسن بکھرا پڑا تھا۔ تنویر اپنے خیالوں میں ایسے محو تھا جیسے وہ اِردگرد سے بالکل بے نیاز ہو۔ اسے سوچنے کی عادت تھی وہ ہر وقت کیا، کیسے اور کیوں میں اُلجھا رہتا تھا۔

رخسانہ کے نزدیک سوچنا تنویر کی عادت نہیں بلکہ بیماری تھی۔ اسی لیے وہ تنویر کو سوچنے والا جانور کہہ کر چھیڑتی تھی۔ اکثر وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی مگر تنویر کو اس کے

آنے کا احساس تک نہ ہوتا۔ اس پر رخسانہ چڑ کر کہتی، ''اے سوچنے والے جانور! تو کہاں ہے؟'' تنویر بدک جاتا اور ہنس کر کہتا، ''اوئے! حیوانِ ناطق! تو کب آئی؟''

صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ چاند طویل سفر کر کے غروب ہونے کے قریب تھا۔ تنویر کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چاندنی کی مدہم لو میں راستہ ٹٹولتے ہوئے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ معمول پر اُفتاد پڑی اور اچانک گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ تنویر خوفزدہ ہو کر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہوا کیا ہے؟ پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ جیسے چاند غروب ہونے سے پہلے بجھ گیا ہو۔ اس احساس سے تو جیسے اس کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ اس کا رواں رواں شدید خوف سے لرزنے لگا۔ اس نے سوچا چاند کی تو اپنی روشنی ہی نہیں ہے۔ یہ تو سورج۔۔۔ وہ ڈر کے مارے کانپتے ہوئے بڑبڑایا، ''نہیں۔۔۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ سورج کو کچھ نہیں ہو سکتا۔'' وہ دہشت زدہ ہو کر گرتا پڑتا سیدھا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے اس کے سامنے یوں کھڑا ہو گیا جیسے ابھی سورج کی موت کا خیال دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جائے گا۔

تنویر کچھ دیر تو دروازے کے آگے دیوار بنا رہا مگر پھر خود کو اس احساس کے سامنے کمزور پا کر جلدی سے لحاف میں دبک گیا اور آنکھیں بند کر لیں اس کا دل تیزی سے دھڑکتا رہا اور سانسیں بحال نہ ہوئیں تو اس نے منہ سے لحاف ہٹایا اور دروازے کو غور سے دیکھا۔ ابھی تک درزیں روشن نہیں ہوئی تھیں۔ اس نے پھر لحاف منہ پر اوڑھ لیا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ ابھی تک تو صبح ہو جانی چاہیے تھی۔ کیا واقعی سورج؟ سورج کی موت کا احساس بار بار اس کے ذہن سے ٹکراتا رہا اور وہ اس سے بھاگنے کی کوشش کرتا رہا۔ کبھی وہ سوچتا کہ شاید وہ خود اندھا ہو گیا ہے۔ اس سے اسے اک گونا اطمینان ہوتا اور وہ دعا کرنے لگتا کہ واقعی ایسا ہی ہوا ہو وہ خود اندھا ہو گیا ہو مگر پھر سورج کی موت کا احساس کسی ڈائن کی طرح اسے دہشت زدہ کر جاتا۔ پھر اسے اچانک رخسانہ کا خیال آیا

اور اس نے سوچا کہ رخسانہ ٹھیک ہی کہتی تھی کہ کسی دن میں سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گا۔۔۔ ہاں واقعی میں پاگل ہو گیا ہوں۔۔۔ سورج کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کے کچھ فضول خیالوں سے وہ اپنا خوف کم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک بار پھر اس نے کانپتی پلکوں سے درزوں کو دیکھا۔ درزیں ابھی تک روشن نہیں ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد اسے باہر سے لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے غور کیا تو باہر لوگ رو رہے تھے۔ آہ و بکا کر رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ درزیں ابھی تک روشن نہیں ہوئی تھیں۔ وہ باہر نکل آیا۔ لالٹینوں کی روشنی میں بے شمار آنکھوں کے شفاف آنسو مدھم لَو دے رہے تھے۔ وہ بھی ان سب کے ساتھ رونے دھونے میں مصروف ہو گیا۔

اس دوران میں کئی دن گزر گئے پر سورج نہ نکلا۔ بزرگوں نے اپنے مخصوص انداز میں لوگوں کو سہارا دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے یہ مصیبت بے چارے لوگوں کے سر تھوپ دی۔۔۔ ایک نے اٹھ کر تقریر کی، ''ہم نہ کہتے تھے۔ برے کام مت کرو لیکن تم ہماری باتیں کہاں مانتے تھے۔ چوری، قتل، ڈاکے، زنا، دوسروں کا مال کھانا، ہر طرح کا گناہ تو تم کرتے تھے۔ لہٰذا اب سورج دیوتا۔۔۔ جو روشنی اور نور کا منبع تھا۔ جو ہمیں راہ دکھاتا تھا۔ جو سمت کے تعین میں ہمارا معاون تھا۔ وہ اس ناپاک سرزمین سے روٹھ کر کہیں دور چلا گیا ہے۔ اب خود کو بہتر بناؤ۔ اپنے آپ کو درست کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

رخسانہ رحم کی التجاؤں میں مصروف تھی۔ جب تنویر نے دِیے کی لو بجھا کر سرگوشی میں اسے کہا تھا، ''رخسانہ! مجھے لگتا ہے کہ سورج بجھ گیا ہے۔'' اس نے تنویر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا، ''یوں نہیں کہتے۔ سورج کو کچھ نہیں ہو گا۔ تم بہت جلد مایوس ہو جاتے ہو حوصلہ رکھو۔'' تنویر نے جب اس رات کا واقعہ سنانا چاہا، جب سورج بجھ گیا تھا اور چاند پتھر بن کر رہ گیا تھا، تو وہ بگڑنے لگی اور اس نے سختی سے منع کیا کہ آئندہ وہ یہ بات کبھی کسی سے نہ کہے۔ اپنے دوستوں سے بھی نہیں۔

لوگوں کی نظریں مشرق کی چوٹیوں پر اٹکی ہوئی تھیں۔ سورج دیوتا روٹھ کر کہیں

دور چلا گیا تھا۔ اب وہ کہاں ہے؟ کس زمین پر چمکتا ہے؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا وہ غروب مغرب میں ہوا تھا سو اب اس نے اسی طرف کسی دیس میں ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ کوئی کہتا سورج مشرق سے نکلتا تھا لہٰذا وہ پیر کہن سال وہیں کہیں تھک کر رک گیا ہے۔

بعد میں یہ افواہیں بزرگوں کے علمی مباحث میں در آئیں تھیں۔ عقل اور وجدان کے بحرِ بے کراں سے موتی اُبلنے لگے تھے۔۔۔ پھر ایک عجیب وغریب فیصلہ ہوا جسے دانش مندی کی معراج قرار دیا گیا ایک غیر متنازعہ بزرگ نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا، ''ہمارا متفقہ فیصلہ ہے کہ تم سب روشنی اور نور کی طرف ایک مقدس اور کٹھن سفر کے لیے تیار ہو جاؤ اور یہ یاد رکھو کہ اب ہمیں سفر کی صعوبتیں برداشت کرنا ہوں گی۔ ان اندھیروں میں بھٹکنا ہوگا اور خود کو بہتر بنانا ہوگا تا کہ ہم پر رحم کیا جائے اور ہمیں وہ دیس مل جائے جہاں سورج چمکتا ہے۔ جہاں نور کی حکمرانی ہے۔ جلدی کرو ضروری سامان باندھ لو تا کہ اس مقدس سفر میں تاخیر نہ ہو۔''

تنویر نے اس فیصلے پر اپنے چند دوستوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ، ''یہ سفر نری حماقت ہے۔ ہمیں بستی کو نہیں چھوڑنا چاہیے سورج شاید اب ہمیں کبھی نہیں ملے گا۔ وہ تو بجھ چکا ہے۔'' دوستوں نے جذباتی ہو کر تنویر کی مخالفت کی اور پوچھا تھا کہ، ''پھر اے دانائے وقت! تو بتا اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' تنویر کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ انہیں اب کیا کرنا چاہیے۔ اسے تو صرف اتنا پتا تھا کہ اس سفر سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ ''وادیٔ رش'' کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے ''وادیٔ رش'' سے محبّت تھی۔ پہاڑوں میں گھری، چناروں اور چیڑ کے درختوں کو دامن میں سجائے۔۔۔ ''وادیٔ رش''۔۔۔ رات کی سیاہی ہو یا دن کا سنہرا پن، شام کی لطیف سُرمئی چادر ہو کہ صبح کی سفیدی، ہر روپ میں وہ پہلے سے زیادہ نکھر جاتی تھی۔ ہر موسم کا پیراہن اس پر یوں پھبتا تھا جیسے رخسانہ پر ہر رنگ کھل اٹھتا تھا۔ اس وادی کو چھوڑنے کا دکھ، تنویر کو بستی آباد کرنے پر کہیں اندر ہی اندر

آمادہ کررہا تھا مگر دوستوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور رخسانہ کی ناراضی سے بچنے کے لیے وہ خاموش ہوگیا۔ سوچنے کی اسے بیماری تھی سو وہ سوچنے والا جانور سوچتا ہوا سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔

لوگ بستی کے باہر کھلے میدان میں اکٹھے ہوئے۔ کس طرف کو چلا جائے؟ روشنی اور نور کا منبع آخر روٹھ کر کس طرف کو گیا ہے۔ اس پر پہلے تو بزرگوں میں تکرار ہوئی۔۔۔ پھر۔۔۔ تکرار میں شدت آئی۔۔۔ پھر جھگڑے ہوئے۔۔۔ پھر جھگڑوں میں تیزی آئی۔۔۔ پھر قتل ہوئے۔۔۔ آخر کار سب طاقتور کے ساتھ چل پڑے۔۔۔ کیونکہ ان کے نزدیک طاقت ہی سچائی کی علامت تھی۔

یہ وہی منحوس دن تھا۔ جب تنویر نے دنیا کی آخری شمع، رخسانہ کی خوبصورت آنکھوں میں بجھتے دیکھی تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ آئندہ وہ ان حسین آنکھوں کو کبھی نہیں دیکھ سکے گا جن سے وہ زندگی کشید کرتا تھا۔ اس کا چہرہ اشکوں سے تر ہوگیا۔ روشنی کے تمام وسیلے ختم ہوئے اور اندھیروں میں روشنی کی تلاش کا سفر شروع ہوگیا۔

یہ لوگ میدانوں، پہاڑوں، صحراؤں، جنگلوں، ویرانوں، دریاؤں اور سمندروں کو پار کرتے، اپنے بوڑھوں اور بیماروں کو پیچھے چھوڑتے، بچے پیدا کرتے، انھیں جوان کرتے، زیادہ گناہ کرتے اور بہت کم ثواب کماتے۔۔۔ مکمل یقین کے ساتھ اور نور کو حاصل کر لینے کے پختہ عزم کے ساتھ بڑھتے چلے گئے۔ تنویر بھی رخسانہ اور اپنے چند دوستوں کے سنگ بے یقینی اور تشکیک کے عالم میں سوچتا اور چلتا چلا گیا۔

ابتدا میں لوگوں کو بہت دقت ہوتی۔ انھیں کچھ سمجھ نہ آتا تھا کہ ایک دوسرے کو کیسے پہچانیں؟ چیزوں کو کس طرح سنبھالیں؟ جانوروں کی دیکھ بھال کیسے ہو؟ راستوں کی ہمواری ناہمواری، دریاؤں کی طغیانی، پہاڑوں کی بلندی گویا ہر چیز اندھیرے کی اوٹ میں کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوگئی تھی۔ آہستہ آہستہ سب لوگ اندھیرے سے مانوس ہونے لگے۔ تنویر نے اس تبدیلی کو بہت جلد محسوس کر لیا تھا۔ یہ مشاہدہ اسے سوچنے کی نئی راہیں

دے گیا اور وہ سوچنے والا، خاموشی سے سوچتا رہا۔

اس تبدیلی کا ذکر سب سے پہلے اس نے رخسانہ سے تب کیا، جب ان کے ہاں چاند سی خوبصورت بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

اس نے رخسانہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا تھا، ''لاؤ مجھے دو، دیکھوں تو کیسی ہے میری لاڈو رانی؟''

رخسانہ نے دکھ اور حیرت کے ملے جلے تاثر سے کہا تھا، ''دیکھوں؟ کیا تم بیٹی کو دیکھ سکو گے؟

تنویر: (اُمید بھرے لہجے میں) کیوں نہیں، مجھے دو۔ (بیٹی کو گود میں لے کر اس نے اُنگلیوں کی پوروں سے اس کا چہرہ چھو کر کہا تھا) یہ پتا ہے کیسی ہے؟

رخسانہ: (مایوسی سے) کیسی ہے؟

تنویر: (مذاق میں) بالکل میرے حیوان ناطق جیسی۔

رخسانہ: ہٹو! جانے بھی دو۔

تنویر: واقعی میں سچ کہہ رہا ہوں، وہی آنکھیں، وہی ناک۔ تم خود دیکھ لو بالکل تمہاری تصویر ہے۔

رخسانہ: (مایوسی سے) میں اسے کبھی دیکھ سکوں گی؟ کیا کبھی ہمیں سورج۔۔۔؟؟

تنویر: او یار! مایوسی چھوڑو، ادھر دیکھو! میری انگلیوں کی پوروں میں آنکھیں اگ آئی ہیں۔

رخسانہ: بس بھی کرو تنویر! تم تو۔۔۔ میں آج بہت پریشان ہوں۔ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔

تنویر: آخر تم میری باتوں پر یقین کیوں نہیں کرتیں۔ تمہیں نہیں لگتا کہ میں دیکھ سکتا ہوں؟

رخسانہ: (روتے ہوئے) ہم اب شاید کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

تنویر: (دلاسا دیتے ہوئے) بس نا! آج مایوسی نہیں، اچھا چھوڑو، سنو! تمہیں پتا ہے میں نے کیسے دیکھنا شروع کیا؟

رخسانہ: (بات ٹالنے کی غرض سے) کیسے؟

تنویر: تمہاری خوبصورت آنکھیں دیکھنے کی۔۔۔شدید خواہش کی وجہ سے۔

رخسانہ: (حیرانی سے) وہ کیسے؟؟

تنویر: میں جب گھپ اندھیرے میں تمہاری آنکھوں کو سہلاتا تھا تو قدرت نے میری انگلیوں کی پوروں میں آنکھیں اُگا دیں۔

رخسانہ (بچی کو سنبھالتے ہوئے ہنس کر) بس حضور! بہت مکھن لگا چکے اب جایئے۔۔۔

تنویر: تم مذاق سمجھ رہی ہو؟ دیکھو! جب میں یہ کہتا تھا کہ یہ سفر بے کار ہے۔ تو سب دوست پوچھتے تھے کہ پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میرے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ تمہاری آنکھوں کی تلاش سے مجھے ان سوالوں کے جواب مل گئے ہیں۔

رخسانہ: تم پھر شروع ہو گئے۔۔۔کیوں میرا دل جلاتے ہو؟ خدا کا واسطہ ہے تنویر کسی سے کچھ مت کہنا کہیں لوگ۔۔۔

تنویر: (سوچتے ہوئے) ابھی نہیں۔۔۔ابھی کچھ سوالوں کے جواب ملنے باقی ہیں۔

رخسانہ: (غصے سے) صرف ابھی نہیں۔۔۔ بلکہ کبھی نہیں۔

تنویر: اوہو!۔۔۔آج غصہ نہیں (ہنستے ہوئے بیٹی لے کر) مجھے دو میں نے اپنی بیٹی سے کھیلنا ہے۔

رخسانہ: (بیٹی دیتے ہوئے) آ آ سنبھال کر۔۔۔کہیں گر نہ جائے۔

تنویر: (ہنستے ہوئے) میں کوئی اندھا ہوں۔۔۔میلی جان!۔۔۔میلا بچہ!۔۔۔

تنویر جو پہلے بے یقینی کی کیفیت میں بے پرواہ نظر آتا تھا۔ اب نئی منزلوں کی دھن میں مستعد نظر آنے لگا۔ معمولی حرکات پر گہری نظر سے تبدیلیاں محسوس کرتا ہوا۔۔۔ سفر کرتا رہا۔۔۔زمانے بیت گئے۔۔۔عمریں ڈھل گئیں۔۔۔

اب اس کے مشاہدے میں تھا۔۔۔

کہ کیسے شروع سفر میں انہیں زمین کی اترائی چڑھائی کا اندازہ نہ ہوتا تھا۔ اب زمین پر پاؤں کی آواز اور ہوا سے لوگ ٹھیک اندازے کرنے لگے تھے۔ ریتلی زمین

کا احساس ہوتے ہی صحرا کی وسعت کا اندازہ کر لیتے، پتھریلی زمین یا چکنی مٹی سے جان جاتے تھے کہ ایک دو دن کی مسافت پر پہاڑ سے نبرد آزما ہوں گے یا دریا سے۔ اب وہ پہاڑ کی اونچائی اور دریا کی طغیانی کو پہلے سے بھانپ لیتے تھے۔ پاؤں کی چاپ سے دوسروں کو پہچاننا تو عام سی بات تھی۔ اب وہ اس آہٹ سے غصے اور نفرت اور خوشی اور دکھ اور بیماری کو بھانپ لیتے تھے۔ آوازوں میں صورتیں نظر آنے لگی تھیں۔ سانسوں کی سنسناہٹ سے فاصلوں کا تعین ہونے لگا تھا۔ اندھیروں میں پیدا ہونے والے بچے تو ایسے بھاگتے دوڑتے، کھیلتے کودتے تھے کہ ٹھوکر تک نہ لگتی تھی۔ جسم نئے ماحول اور مسائل کے ساتھ ڈھلنے لگے تھے کیونکہ اندھیرے میں زمانے بیت گئے تھے۔۔۔ عمریں ڈھل گئیں تھیں۔

تنویر اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ رخسانہ کو رخصت ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ وہ خود بھی اب موت کو کافی قریب محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ مرنے سے پہلے دل کا بوجھ ہلکا کر لے اور لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دے جو وہ جانتا تھا۔۔۔ تاکہ بستی آباد ہو جائے۔ ''وادی رُش'' کے مناظر کو اس کی کمزور بینائی بھی دھندلا نہیں سکی تھی۔

تنویر نے پورے مجمع کو اکٹھا کیا اور بڑے بارعب اور پُروقار لہجے میں انہیں سمجھایا۔ ادھر ادھر ٹھوکریں کھانے کی بجائے بستی آباد کرنے کا مشورہ دیا۔ اپنے قوانین خود بنانے کی تلقین کی اور انہیں یہ خبر بھی دی کہ آئندہ نسلیں نابینا ہوں گی کیونکہ ہماری آنکھوں کا استعمال ختم ہو گیا ہے۔ اس نے کہا، ''ہمیں جو کرنا ہے اس اندھیرے میں خود کرنا ہے۔ اگر چہرے پر آنکھیں بے معنی ہو گئی ہیں تو یقین جانو! ہمارے ہاتھوں میں، ہماری اُنگلیوں کی پوروں میں، ہمارے پاؤں میں، ہمارے کانوں میں، ہماری سانسوں میں، ہمارے جسم کے ایک ایک روئیں میں ہزاروں آنکھیں اگ آئیں گی۔۔۔ مگر اس وقت جب ہم ان اندھیروں سے دوستی کر لیں گے۔'' اس نے دلیلوں اور مثالوں سے اپنی بات سمجھائی۔ مگر۔۔۔ تقریر ختم ہوتے ہی اسے بھی ختم کر دیا گیا۔ لوگ سورج اور مقدس سفر کے متعلق ایک لفظ نہیں سننا چاہتے تھے۔ لوگوں نے اسے خوب برا بھلا کہا۔ تنویر کی موت پر اس کی

بیٹی اور اس کے ساتھ کھڑے خوب رو مرد کے علاوہ کسی نے افسوس نہ کیا۔ انہی دونوں کے طفیل تنویر کے خیالات اگلی نسلوں کو منتقل ہوئے۔

تنویر کی تقریر سے سفر تو نہ رکا بہر حال اس کی موت نے قافلے والوں کو ایک خوشی کا تہوار ضرور دیا۔ تقریریں ہوئیں۔ مایوسی کی علامت کے خاتمے پر خوشی منائی گئی۔ پھر ہر سال قافلہ تین دن تک رک کر جشن منانے لگا۔ بعد میں اسی جشن نے باقاعدہ مذہبی تہوار کی صورت اختیار کر لی۔

اس کے بعد کئی صدیاں گزر گئیں۔

۔۔۔ پھر وہ کیسا بھیانک دن آیا۔ اس دن سے بھی زیادہ خوفناک جب سورج مردہ ہو گیا تھا اور چاند بجھ کر پتھر رہ گیا تھا۔ اس دن سے بھی زیادہ خطرناک جب تنویر نے لوگوں کو حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔۔۔ ہاں وہ کیسا بھیانک دن تھا۔۔۔ جب لوگوں کے دل دہل گئے تھے۔ جب تنویر کی نسل میں ایک بغیر آنکھوں والا بچہ پیدا ہوا تھا۔۔۔ دائی اسے دیکھ کر چلائی تھی۔۔۔ "اس بچے کی آنکھیں نہیں ہیں۔ بچے کے گال اس کے ماتھے سے ملے ہوئے ہیں۔" یہ سنتے ہی مجمع میں کہرام مچ گیا تھا۔ لوگ رونے لگے تھے۔ بین کی آوازوں سے آسمان تھرا گیا تھا۔

بزرگوں نے اس نحس بچے کی پیدائش پر روح پرور تقریریں کیں۔ ایک نے کہا، "یہ بچہ اس بے یقین اور بے ایمان تنویر کی اولاد میں سے ہے۔ جسے اس کے اپنوں نے قتل کیا تھا۔ اس کمبخت کی ہر نسل کے ایک دو افراد ہمارے ہاتھوں قتل ہوتے رہے۔ یہ لوگ ہمیشہ ہمارے اندر بے چینی اور اداسی پھیلاتے رہے۔ یہ بچہ اس خاندان پر عذاب کی دلیل ہے۔ اسی کمبخت نے کہا تھا۔ آئندہ نسلیں نابینا ہوں گی۔ تو دیکھ لو ہمارے بچے تو آنکھوں والے ہیں۔ لیکن اس کی اولاد نابینا پیدا ہو رہی ہے۔ خود کو بہتر بناؤ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔"

لوگوں نے تنویر کے نومولود وارث اور اس کے خاندان کو ختم کر دیا۔ اس کی نسل،

اس کے خیالات کی طرح تہِ خاک چلی گئی۔ اس دن کو یوم نجات قرار دیا گیا اور ایک بہت بڑے جشن کا اہتمام ہوا۔ اس جشن کے دوران مٹھائیاں تقسیم ہوئیں، کھیل تماشے ہوئے، کھو کھلی ہنسی اور قہقہے فلک شگاف ہو گئے۔ جشن کے دوران نو حاملہ عورتوں کے درد اٹھا اور ان کا درد پورے مجمع کا دکھ بن گیا۔۔۔ دائی چلائی۔۔۔ ''ان بچوں کے گال بھی ماتھے سے ملے ہوئے ہیں۔'' پھر رونا دھونا، چیخنا چلانا شروع ہو گیا۔ لوگ مایوس ہونے لگے تو بزرگ حوصلے کا مرہم لیے آموجود ہوئے اور چرب زبانی کے جوہر دکھانے لگے۔

جو بزدل تھے۔ ان پر خوف مسلّط کیا۔ دیوانوں پر شراب عشق کے خم کے لنڈھا دیے۔ جو ذہین تھے انہیں علمِ کلام سے تہِ دام کیا۔۔۔ اور سفر شروع ہو گیا۔

اگلے کئی سو سال بعد بھی کوئی بستی آباد نہ ہو سکی تھی۔ نور کی تلاش کا مقدس سفر جاری تھا۔ لوگ میدانوں، پہاڑوں، صحراؤں، جنگلوں، ویرانوں، دریاؤں اور سمندروں کو پار کرتے اپنے بوڑھوں اور بیماروں کو پیچھے چھوڑتے، بچے پیدا کرتے، انہیں جوان کرتے، زیادہ گناہ اور بہت کم ثواب کماتے۔۔۔ مکمل یقین کے ساتھ اور نور کو حاصل کر لینے کے پختہ عزم کے ساتھ بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اب بھی قافلہ تین دن تک رک کر تنویر کی موت کا جشن مناتا تھا۔ اب بھی اس تہوار پر اس دور کے بزرگ زبان دانی کے جوہر دکھاتے تھے لیکن افسوس اب تمام قافلے والوں کے گال ان کے ماتھے سے ملے ہوئے تھے۔!!!

اتفاق محض اتفاق

میں جب بھی گھر پر اکیلا ہوتا ہوں تو دروازے بند کر کے کھڑکیوں کے سامنے پردے تان کر لباس کی گھٹن سے آزاد ہو جاتا ہوں اور کمروں میں دیر تک ٹہلتا ہوں۔ اس حالت میں مجھے بہت سکون ملتا ہے ایسا سکون اور اس طرح کی طمانیت جیسی سچ بولنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ایسے میں کسی کی آمد ایک بلائے ناگہانی سے کم نہیں ہوتی۔ لباس پر لباس پہننے کی اذیت اس قدر جاں کاہ ہوتی ہے کہ ناقابلِ بیان ہے۔

آج بھی اسی طرح ہوا بقول غالب ''بیڑی اور ہتھکڑی'' سے شام تک نجات حاصل تھی اور دفتر سے چھٹی، مابدولت گھر میں تن تنہا کپڑوں سے بے نیاز گشت میں مصروف تھے کہ گھنٹی برراہِ گوش جسم میں پیوست ہونے لگی۔ جسم ساکن ہوا زبان میں حرکت پیدا ہوئی اور منہ سے گالیوں کے جھرنے پھوٹ پڑے۔ یہ گالیاں ہرگز ہرگز اس ہاتھ کے لیے نہیں تھیں۔ جس نے بٹن داب رکھا تھا بلکہ یہ نذرانۂ عقیدت ان فلسفیوں کے حضور تھا جو یہ کہہ مرے ہیں کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔

میں تیز تیز کپڑوں میں داخل ہوا اور دروازہ باہر کی جانب کھول کر مصنوعی مسکراہٹ سے لیپا ہوا چہرہ مہمانِ خاص کے سامنے کر دیا۔ سامنے سرمد دہریہ تھا۔ میں ایک منافقانہ قہقہے کے ساتھ اس سے بغل گیر ہو گیا۔ ڈرائنگ روم کھلا، پانی آیا، سگریٹوں

کے سرے روشن ہو گئے۔ ہونٹوں پر روایتی قسم کے لایعنی جملے کمرے کی ایش ٹرے میں جھڑنے لگے۔ میں دل ہی دل میں سوچ سوچ کر کڑھتا رہا کہ یہ شخص صبح دس بجے؟ کیا اس کمبخت کو بھی آج چھٹی تھی؟ آخر میں نے جی کڑا کر کے پوچھ ہی لیا، ''یار سرمد! آج تم نے بھی چھٹی لے رکھی تھی کیا؟'' کہنے لگا، ''نہیں میں نے شارٹ لیو (Short Leave) لی ہے۔'' پہلے تو مجھے خوشی ہوئی کہ جان بخشی جلد ہو جائے گی۔ پھر اندر سے ایک آواز آئی، ''ارے خبیث ایسی بھی کیا قیامت آن پڑی تھی کہ تم کارِ منصبی میں عارضی تعطل پیدا کر کے یہاں براجمان ہو؟'' خیر میں نے خود پر قابو پایا اور جو سرمد کو غور سے دیکھا تو اس کے چہرے پر پریشانی رینگتی دکھائی دی۔ میں نے اس سے پوچھا، ''خیر تو ہے؟ آج تم کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو۔'' اس نے کہا، ''ہاں یار آج میں بہت پریشان ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اندر سے اتنا کمزور ہوں۔ اس قدر وہمی ہوں۔ تمہیں تو پتا ہے کہ میں نے ہمیشہ وہم کے خلاف جہاد کیا ہے۔ آج۔۔۔ آج میں خود۔۔۔ میں۔۔۔ یار ماجد!۔۔۔ آج میں بالکل ٹوٹ گیا ہوں۔ میں نے پچھلے دو گھنٹوں سے خود کو تعمیر کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی اینٹ گارا میرے ہاتھ نہ آیا۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا، ''آخر ہوا کیا ہے؟ اس نے کہا، ''مجھے وہم ہو گیا ہے۔ دیکھو ماجد! تم سوچ سکتے ہو کہ مجھ جیسے آدمی کو بھی وہم ہو سکتا ہے۔'' اور اس نے سر جھکا لیا۔ مجھے اس کی باتیں سن کر واقعی حیرت ہو رہی تھی کہ ہر وقت توہم پرستی کے خلاف چیخنے چلانے والا شخص اور مذہب تک کو وہم سے تعبیر کرنے والا آج کیسی باتیں کر رہا ہے۔ میں نے پھر پوچھا، ''سرمد! آخر کچھ تو پتا چلے یار ہوا کیا ہے۔ تم تو ویسے پہیلیاں بوجھوا رہے ہو۔ پلیز!!'' میرے اصرار پر اس نے اپنی بپتا کہنی شروع کی۔۔۔۔

''یار ماجد! تمہیں تو پتا ہے کہ جب کبھی ''روزی'' کا شوہر شہر سے باہر ہوتا ہے وہ مجھے بلا لیتی ہے اور میں اکثر اس سے مل آتا ہوں۔'' میں نے کہا، ''ہاں یہ تو مجھے پتا ہے۔'' اس نے بیان جاری رکھتے ہوئے بتایا، ''کل اسی طرح ہوا کہ رات کو اس کا فون آیا کہ آج

وہ گھر پر اکیلی ہے۔ صبح نو بجے کا وقت مقرر ہوا۔ میں بہت خوش تھا۔ میں نے اپنی مرضی کے کپڑے استری کروائے اس کی مرضی کا پرفیوم سامنے کر کے رکھا۔ رومال، موزے، جوتے سب کچھ تیار ہو گیا اور میں کل کے خواب دیکھتا ہوا کروٹ بدلتے بدلتے آخر سو ہی گیا۔ میں نے صبح اس سے ملنا تھا اور پکڑے جانے کا خوف میرے لاشعور میں تھا۔ رات میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں بالکل برہنہ ہوں لوگوں نے میرا منہ کالا کر رکھا ہے اور گلے میں جوتیوں کا ہار ہے۔ خیر جب میں صبح بیدار ہوا تو مجھے اپنا خواب یاد نہیں تھا۔ میں تیاری میں مصروف ہو گیا۔ خوب رگڑ رگڑ کر شیو کیا۔ آئینے کے سامنے دیر تک اٹکھیلیاں کرتا رہا اور گنگناتے ہوئے گھر سے نکلا۔ دفتر پہنچا شارٹ لیو ٹائپ کی، ڈرتے ڈرتے باس کے پاس گیا۔ وہ مان گیا۔ سو ایک مشکل مقام طے ہوا۔ اب آٹھ سے نو کرنا قیامت ہو رہے تھے۔ اس لیے میں اپنے دفتر کی بجائے اشرف کے پاس چلا گیا۔ وہ کمبخت کسی کولیگ کو اپنا کوئی خواب سنا رہا تھا۔ مجھے بھی اپنا خواب یاد آ گیا حالانکہ میں ان باتوں پر سرے سے، تمہیں تو پتا ہے، سرے سے یقین نہیں کرتا پر شاید آدمی خوشی میں اپنے عقیدے سے کچھ سرک ہی جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور میں نے اس کو اپنا خواب سنا دیا۔ خواب سن کر اس نے کہا! سرمد آج تیری ٹک کے بے عزتی ہونی ہے۔ لگتا ہے آج تیری کوئی چوری پکڑی جائے گی۔ حالانکہ اس نے یہ بات ہنستے ہوئے بالکل مذاق میں کہی تھی۔ لیکن پتا نہیں یار! تیر میرے دماغ میں کہاں جا کر نشانے پر بیٹھا کہ باوجود کوشش کے نہیں نکلتا۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے ڈرائیو کر رہا ہوں۔ جب بھی اس کے گھر کے قریب جاتا ہوں تو اشرف کے مکالمے اس اونچی آواز میں اوور لیپ ہوتے ہیں کہ میں گاڑی کا رخ بالکل مخالف سمت کر دیتا ہوں۔ ماجد! تم یقین نہیں کرو گے کہ پچھلے ایک گھنٹے سے میں کس اذیت میں ہوں۔ یار میں اپنی اس حرکت پر خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔"

میں نے سرمد کی باتیں سن کر ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا، "کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ اجی سرمد صاحب! آپ ٹھہرے فلسفے کے بحرِ بے کراں کے شناور۔ وہم پر آپ کی مدلل

تقریریں سن کر ہم جیسے کٹ ملاؤں کے مضبوط ایمان والے قلعے بھی لرز جاتے ہیں۔ آپ کی منطق کے سامنے ہم سے ''کوا سفید ہے'' کہے نہیں بنتی اور آپ ایک خواب سے ہار گئے۔ واہ جی واہ!! ارے حضور! مرد بنیے مرد۔ وہ دختر بداختر راہ دیکھتی ہوگی، جائیے۔ شاید میں نے یہ سب کچھ خود غرضی میں کہا تھا کیونکہ مجھے اس کو ٹالنا اور اپنی آزادی مقصود تھی لیکن سرمد میاں پر اس مختصر مگر جامع تقریر کا بہت اثر ہوا اس سے پہلے تو انہیں اپنی منہدم عمارت کا اینٹ گارا گویا دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ اب جو محل تعمیر نظر آیا تو وہ ایک نعرے کے ساتھ اٹھا اور اس نے چلاتے ہوئے کہا: او ماجد! تم نے مجھے زندہ کر دیا ہے۔ یقیناً! اگر یہ موقع محل ہماری کسی فلم کا ہوتا تو سرمد کا مکالمہ یہ ہونا تھا۔۔۔ ''روزی ی ی ی ی۔۔۔ میں آ آ آ آ رہا ہوں ں ں ں ں۔''

بہر حال میرے گھر سے سیلاب بلا ٹل گیا میں نے یہ کہے بغیر کہ

ع کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

دروازہ بند کر دیا اور ان فلسفی صاحبان سے، جنہیں میں نے کچھ دیر پہلے گالیاں بکی تھیں، معذرت چاہی اور انسان کو آزاد کر دیا۔

شام کو بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر میں انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے آج ان کو بہت مس کیا ہے اور میں ان کے بغیر کبھی اکیلا خوش نہیں رہ سکتا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھایا اور پوچھا، ''کون؟'' جواب ملا، ''تمھارا باپ۔'' ۔۔۔ ''سرمد! خیر تو ہے نا، تم کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ ''تھانے'' ۔۔۔

مکروہ

بد بودار، بدمزہ اور جان لیوا حد تک مکروہ گوشت کے بے ہنگم لوتھڑے اور سڑاند سے لبریز تہہ دار جھلی کو زبان سے سہلاتے ہوئے اسے محسوس ہوا جیسے کریہہ رقیق مادے کے ننھے ننھے چشمے پھوٹ کر زبان کی پھسلن میں آسانی پیدا کرنے لگے ہیں۔ آج اپنے دل میں کراہت نہ پا کر شاید پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ ذائقے کا تعلق صرف زبان سے نہیں ہوتا۔ روٹی کی شدید طلب وہ سیلاب ہے جو سب کچھ بہا لے جاتی ہے۔ اچھا بُرا، مکروہ پاکیزہ، گناہ ثواب، غیرت بے غیرتی وغیرہ وغیرہ، سب کی جڑیں معدے کے کسی گوشے میں آپس میں گتھی ہوئی ہیں یا شاید ہر دو کی جڑ ایک ہی ہے اور وہ کسی صورت بھی ہمارے معدے سے باہر نہیں ہے۔

اب اس کی زبان اور اس کے ہاتھوں کی حرکات میں ایک لے اور ایک ترتیب آ گئی تھی۔ شاعری کے وزن کی طرح بحروں کے ساکن اور متحرک پر لفظ خود بخود بیٹھتے چلے جا رہے تھے۔ لڑکے نے معمولی سا سر اوپر کیا اور رئیسہ کو دیکھا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ زبان کا آہنگ، اس کی ترتیب اور وزن میں بال برابر فرق نہ آئے۔ مادر زاد برہنگی سے اس کی نظر پھسلتی چلی گئی۔ محرابی اٹھانوں کے بیچ سے اس نے دیکھا رئیسہ کا سر پیچھے کو جھکا ہوا تھا۔ اس کا منہ نیم وا تھا۔ جس سے خفیف آوازیں اور سسکاریاں محو پرواز تھیں۔ جو کمرے کی

فضا کو مزید بوجھل کر رہی تھیں۔ اس کی ٹوٹتی سانسوں میں ایک بے ترتیب سا طلسماتی ردھم قائم ہو گیا تھا۔

رئیسہ کے جسم کا تناسب، اس کے پیچ و خم، اس کے زاویے، قوسیں اور جلد کا چکنا پن ایسا تھا کہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر فنا کر دینے کو جی چاہے لیکن لڑکے نے صرف اس بات کا جائزہ لیا کہ کیا وہ انتہائی مہارت کا ثبوت دے رہا ہے؟ رئیسہ اس بُرکھائرت کی کھنکناہٹ میں کمی یا بیشی تو محسوس نہیں کر رہی؟

آج سے صرف چند دن قبل، اپنے پہلے تجربے کی نسبت وہ کتنا ماہر اور مشاق ہو گیا تھا۔ نہ قے، نہ متلی، نہ سڑاند کا احساس بلکہ اس کی زبان کا ایک ایک خلیہ اور ہر ایک پٹھا ایک تسلسل میں کمال مشاقی سے نشیب و فراز پر رقصاں تھا اور ہاتھوں کا ہمکنا بلا کا فطری معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں بالکل سپاٹ، کسی بھی جذبے سے عاری، کسی بھی نشے سے بے بہرہ، کسی بھی لطف سے بے نیاز کالے سیاہ بالوں کے مختصر ہجوم پر جم گئیں۔ جن کی سرحدیں بھورے رنگ کی تھیں اور ان کے عین اوپر سے پتلی سی معدوم ہوتی سنہری ندی ناف میں گر رہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہوئے اس پر منکشف ہوا، جو بال اپنی جڑ میں تنہا تھا وہ پھوٹتے ہی خم کھا جاتا اور کمزور دکھائی دیتا تھا۔ اس کے مقابلے میں جہاں ایک مسام سے دو بال نکلے ہوئے تھے۔ وہ پہلے کی نسبت ذرا اوپر سے خم کھاتے اور مضبوط دکھائی دیتے تھے۔ اس نے سوچا تنہائی اور اکیلا پن ہر چیز کو کتنا کمزور کر دیتا ہے۔ اسے تنہا جڑ والے بال بالکل اپنی طرح یتیم الطرفین اور لاغر محسوس ہوئے۔

رئیسہ نے اس کا سر رانوں میں بھینچ لیا۔ زبان کا ردھم تبدیل ہوا۔ ہاتھوں کا دائرۂ کار ممکنہ حد تک وسیع ہو گیا۔ اس کی سپاٹ اور جذبوں سے عاری آنکھیں اب بالوں سے ذرا اُوپر ہٹ کر کالے بھجنگ تِل پر جم گئیں۔ رئیسہ کی صاف شفاف چمکیلی جلد سے ذرا سا اٹھا ہوا یہ تِل کتنا برا لگ رہا تھا۔

اب رئیسہ کے ہر مسام سے جوالا مکھی ابلنے کو تیار تھا۔ اس کا ہر خلیہ، ہر ریشہ خون

کی طغیانی سے پھٹا جا رہا تھا۔ رُواں رُواں وجد کے عالم میں مرتعش تھا اور خلیہ خلیہ نشے سے مخمور تھا۔ اس پر لڑکے کی سنگت کہ ہر ماترا اور ہر سم ٹھیک پڑ رہا تھا۔

جیسے ہی رئیسہ کی حرکات میں تیزی آئی، لڑکے کو احساس ہو گیا کہ لذت و سرشاری کا طوفان تھمنے کے قریب آن پہنچا ہے۔ زبان میں تیزی آئی رقیق مادے کے چشمے ایک آدھ سیکنڈ کے لیے بالکل خشک ہوئے اور پھر ہر طرف چکناہٹ پھیل گئی۔ رئیسہ ڈھیر ہو گئی۔ لڑکے نے رخسار سے، ہونٹوں سے، ٹھوڑی سے، کف اور کریہہ مادے صاف کیے اور لیٹ گیا۔

کچھ دیر بعد پیاس کی شدّت سے اٹھ کر سائیڈ ٹیبل پر پڑے گلاس میں پانی ڈالنے ہی لگا تھا کہ رئیسہ چلائی ''گلاس کو مت چھونا غلیظ، مکروہ''۔۔۔ یہ سُن کر لڑکے کا رنگ تِل کی طرح کالا بجھنگ ہوا اور وہ ندامت سے تنہا جڑ والے بال کی طرح خمیدہ ہو گیا۔

رنگین رسی

بابے کی ایک عادت انتہائی عجیب تھی۔ اسے کوئی کیسی ہی بری بات کہہ دیتا یا کیسا ہی شرم ناک الزام لگاتا، وہ کوئی جواب دیے بغیر، غصے میں، نظریں جھکا کر، تیز تیز پلکیں جھپکتا اور سر کو زوردار جھٹکا دے کر وہاں سے چل پڑتا۔ پھر آپ ہی آپ یہ یقین کر لیتا کہ بات گئی گزری ہو گئی ہے۔ اس عادت کی وجہ سے وہ ایک مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ ویسے بھی اب وہ عمر کے اس حصے میں تھا۔ جہاں اچھی عادتیں پختہ اور بری پختہ ترین ہو جایا کرتی ہیں۔

بابا اس عمر میں بھی وجاہت کی تصویر تھا۔ صاف ستھرا، سلجھا ہوا۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ کھیتوں میں کام کرنے والا، مال مویشی پالنے والا سیدھا سادہ دیہاتی ہے۔ بابے کا رکھ رکھاؤ، ایثار اور دھیما لہجہ اس کی بیوی صغراں کی طرح پورے گاؤں کو اپنے سحر میں گرفتار کیے ہوئے تھا لیکن صغراں نے اس بات کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا اور شاید بابے کو کسی ایسے اظہار کی ضرورت بھی نہ تھی۔

بابا ہر جگہ نمایاں نظر آتا تھا۔ اس دفعہ جب قربانی لینے منڈی گیا تو ہر بیوپاری اپنا ڈنگر اسی کو بیچنا چاہتا تھا۔ بابا ہر جانور کو دور سے دیکھتا اور آگے نکل جاتا تھا۔ آخر بابے کی نظر ایک بکری پر پڑی جسے اس نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اونچی لمبی، صراحی جیسی گردن

والی، چلتی ہوئی آتی تو جیسے خوشی خوشی ناچتی اور اٹھلاتی چلی آ رہی ہو۔ شیمپو سے نہلائی، مہندی لگی، بکری کیا تھی دلہن تھی دلہن۔ بابے کا تو جیسے اس پر دل ہی آ گیا تھا۔

بابے نے بکری کیا دیکھی وہ صغراں کی سخت تنبیہ کو جیسے بھول ہی گیا تھا۔ حالانکہ اس بار اس نے پہلی مرتبہ غصے میں کہا تھا کہ قربانی کے لیے اللہ نے مینڈھا بھیجا تھا کوئی لیلی ویلی نہیں اُتری تھی آسمانوں سے۔ اس بار دُنبہ یا بکرا لے کر آنا اور ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ پڑوسیوں کے بیل میں الگ حصّہ ڈالے گی۔

بابے نے صغراں پر کبھی سختی نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود وہ بابے کے سامنے بہت دبی دبی سی رہا کرتی تھی۔ لیکن کچھ عرصے سے وہ تلخ مزاج ہوتی جا رہی تھی۔ خصوصاً جب سے وہ درس میں جانا شروع ہوئی تھی، روایتوں اور حدیثوں کے حوالے دے کر خاصی منہ پھٹ ہو گئی تھی لیکن بابا ہمیشہ کی طرح خاموشی سے اپنی مرضی کر کے حکمرانی کا شوق پورا کر لیتا تھا۔

سو بابے نے منہ مانگی قیمت دے کر بکری خرید لی۔ جب وہ لہکتی، لچکتی بکری لے کر منڈی سے نکلا تو اسے صغراں کے سخت الفاظ یاد آ گئے۔ اس نے، نظریں جھکا کر، تیز تیز پلکیں جھپکائیں، اور سر کو زوردار جھٹکا دے کر چل پڑا، گویا بات گئی گزری ہو گئی۔ ویسے بھی مال مویشیوں اور ان کے باڑے سے صغراں کا کوئی تعلق نہ تھا۔

صغراں پر گاؤں کی عورتیں رشک کرتی تھیں۔ دودھ دوہنا، صفائی ستھرائی، چارہ ڈالنا، بیمار ڈنگر کی دیکھ بھال یہ سب کام بابا خود شوق سے کرتا اور کسی کی مداخلت گوارا نہ کرتا تھا۔

بابے کے گھر کے ساتھ وہ مثالی باڑا تھا۔ جسے دُور دراز کے دیہاتوں سے لوگ دیکھنے آتے تھے۔ دس بارہ گائے، بھینسوں اور بکریوں پر مشتمل باڑے میں نہ کچرا، نہ گوبر مینگنیاں، نہ بدبُو اور مالک ہر وقت اجلے کپڑوں میں، تیل سُرمہ لگائے، جو دیکھتا حیران رہ جاتا تھا۔

بابے نے جان بوجھ کر بکری کو گاؤں سے باہر ہی اُتار لیا اور پیدل چلنے لگا۔ جو بھی شخص بکری کو دیکھتا کچھ لمحوں کے لیے ساکت ہو جاتا تھا۔ ایسی ناز و انداز سے چلتی بکری اس سے پہلے کسی نے نہ دیکھی تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے بابے اور بکری کے ساتھ ڈھیروں باراتی جلوس کی طرح چلتے آ رہے تھے۔

جب دونوں گھر میں داخل ہوئے تو صغراں نے انوکھی بکری کو دیکھنے سے پہلے اس کی پچھلی ٹانگوں کا جائزہ لیا۔ تھن دیکھ کر جل بھُن گئی۔ رش زیادہ تھا۔ ہر شخص تعریفیں کر رہا تھا۔ وہ بے چاری خاموش ہو گئی۔ بابا اپنی نئی نویلی بکری کی رنگین رسی تھامے مسکرا رہا تھا، خوش ہو رہا تھا۔

قربانی میں ابھی ایک پورا دن باقی تھا۔ چھریاں صغراں کے دل پر چل رہی تھیں۔ رات کو بکری نامانوس جگہ کی وجہ سے بہت منمنا رہی تھی۔ بابے نے پہلے تو سونے کی کوشش کی لیکن جب وہ چپ نہ ہوئی تو وہ اٹھ کر باڑے کی طرف چلا گیا۔

صغراں نے بابے کی وجاہت کی وجہ سے کبھی اس کا پیچھا نہیں کیا تھا۔ بہر حال شک تو اسے شروع سے تھا۔ بے شمار شواہد ایسے تھے جن پر وہ کہرام برپا کر سکتی تھی۔ لیکن اسے بابے کی بھلمنساہٹ اور مونچھوں کی اکڑ پر مان تھا۔ وہ اس کے پُرشکوہ چہرے پر ندامت نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ جو کچھ بھی تھا اس سے پہلے اس نے کبھی جاسوسی کا سوچا بھی نہ تھا۔ لیکن یہ بکری اس کے لیے جیتی جاگتی سوتن بن گئی تھی۔ آج صغراں بابے کا بت پاش پاش کرنا چاہتی تھی۔

وہ بُت پرست، بت شکنی پر آمادہ تو ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی جرأت کی راہ میں محبت اور عقیدت آڑے آ رہی تھی۔ وہ کپکپاتے جسم اور دھڑکتے دل کے ساتھ باڑے میں داخل ہوئی۔ بکری خاموش ہو چکی تھی۔ جس کمرے میں مال مویشی تھے۔ اس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ صغراں کو یاد آیا۔ کھڑکی کی ایک چٹخنی کچھ سرکی ہوئی ہے۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھی۔

جلاپے کی جرأت کہہ رہی تھی کہ بابا رنگے ہاتھوں پکڑا جائے پر صغراں کا دل یہ دُعائیں مانگ رہا تھا کہ بابا اس مقدمے سے صاف صاف بری ہو جائے۔ اسی کشمکش میں اس نے کھڑکی کی درز سے اندر جھانکا۔ لالٹین کی مدہم لو میں صرف وہ کلہ اور اس سے بندھی رنگین رسی کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ رنگین رسی مسلسل ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر ہو کر بابے کو دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر ہچکولے کھاتی رسی کے سوا اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔

۔۔۔ رسی مسلسل ہچکولے کیوں کھا رہی تھی ؟؟؟ ۔۔۔

وہ واپس کمرے میں آ گئی۔ پریشانی نے اس کو ادھ موا کر دیا تھا۔ رنگین رسی وہ پھندا بن گئی تھی۔ جس پر کبھی بابا جھول جاتا تھا کبھی صغراں کا دیوہیکل شک ۔۔۔ آخر میں تو اس رسی سے خود صغراں کی سانسیں بند ہونے لگی تھیں۔

اس نے بہت سوچا ۔۔۔ شواہد مکمل نہیں تھے۔ وہ ہر بار بابے کو شک کا فائدہ دے رہی تھی ۔۔۔ آخر اس نے کچھ بھی تو نہیں دیکھا تھا۔ رسی کے ہچکولے کھانے کی ہزار وجوہات ہو سکتی تھیں۔ شاید رنگین رسی ہچکولے کھا ہی نہ رہی ہو ۔۔۔ بلکہ لالٹین کی باتی بھی تو خراب تھی۔ شعلہ اکثر لرزتا رہتا تھا ۔۔۔ وہ بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

اگلے روز ان کے گھر وقت دوہری چال چلنے لگا تھا۔ صغراں کا وقت اپاہج ہو گیا تھا ۔۔۔ ایک لمحہ پہروں رینگ کر دوسرے لمحے تک پہنچتا تھا۔ جبکہ بابے کا وقت مٹھی بھر ریت کی طرح ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔

سارا دن دونوں عید کی تیاریوں میں مصروف رہے۔ خلافِ معمول دونوں کا دھیان باڑے کی طرف، پہلے کی نسبت کچھ زیادہ رہا ۔۔۔ بابا شام کو کپڑے بدل کر باہر جانے لگا تو اس نے دیکھا کہ صغراں بکری کا ایک آدھ بال لیے (جو قمیص یا شلوار میں کہیں اٹکا رہ گیا تھا) کسی مشاق تفتیشی افسر کی طرح بغور معائنہ کر رہی تھی۔ وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

ان دونوں کی اس موضوع پر عید کے دن بھی کوئی بات نہ ہوئی ۔۔۔ سب ویسے

ہی چلتا رہا۔۔۔صغراں کی قربانی کا حصہ آچکا تھا۔۔۔وہ شریعت کے مطابق گوشت تین حصوں میں تقسیم کیے۔عجیب بے چینی کے عالم میں بیٹھی تھی۔۔۔بابا چونکہ خود کسی جانور کے گلے پر چھری نہ پھیرتا تھا۔اس لیے دیر سے بکری کا گوشت لیے گھر پہنچا۔۔۔صغراں نے بابے کے سامنے،اس کی بکری کا گوشت جلدی جلدی اقربا اور مساکین کے حصوں پر انڈیل دیا اور حکم چلایا،''یہ تقسیم کروادو''۔۔۔بابا غصے سے اٹھا،نظریں جھکا کر، تیز تیز پلکیں جھپکائیں اور سر کو زوردار جھٹکا دے کر وہاں سے چلا گیا۔پھر آپ ہی آپ یہ یقین کر لیا کہ بات گئی گزری ہو گئی ہے۔

آپ بیتی/سوانح عمری؟؟؟

وہ بہت پریشان اور شدید حیرت میں غرق تھا۔وہ تو کبھی اتنا چکنا نہیں تھا کہ ہاتھوں سے پھسل جائے۔۔۔مگر آج۔۔۔وہ ہر بار اپنے ہی ہاتھوں سے پھسلتا چلا جا رہا تھا۔جب خود کو پکڑنے کی کوشش میں وہ مایوسی کی حد تک ناکام ہو گیا تو اس نے اپنے جسم کی چکناہٹ محسوس کرنے کے لیے بدن کو چھوا پھر ہاتھوں کو مضبوطی سے بند کر کے پھر پوری قوت سے کھول کر دیکھا اور حیران ہوا کہ نہ جسم چکنا، نہ گرفت کمزور، اس کے باوجود ہر کوشش ناکام؟ وہ کسی بھی طرح خود کو پکڑائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے سوچا کہ اس کے بہن بھائی، ماں باپ، دوست احباب، بیوی بچے، اسے کس مضبوطی سے اپنے لاغر ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھے۔اس کے دشمنوں نے کیسے اپنی گرفت کمزور ہونے کے باوجود اسے کئی مرتبہ چاروں شانے چت کیا تھا۔۔۔اور ہاں وہ لڑکیاں ان کی لمبی اُنگلیوں کی نرم پوریں مَس ہوتے ہی، وہ کیسے موم کا گُڈا بن جاتا تھا کہ جس طرف مرضی ہے موڑ لو، جو چاہے بنا ڈالو۔یہ سب کیا تھا؟

اس نے سوچا شاید وہ کبھی کسی کی گرفت میں نہیں رہا تھا کیونکہ ان تمام لوگوں کی پکڑ بہت کمزور تھی۔اس احساس کے ساتھ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ شاید اس کی اپنی گرفت بہت مضبوط تھی۔شاید اس نے اپنے قریب بسنے والوں کو اپنی توانا بانہوں میں

تھامے رکھا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو انتہائی فخر سے دیکھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں کہا، ''میری گرفت بہت مضبوط ہے۔ سب میری گرفت میں تھے۔''

بہن بھائی، ماں باپ، دوست احباب، بیوی بچے، سب اس کی مضبوط گرفت میں تھے۔ کس طرح کئی خطرناک دشمن اس کی پکڑ میں آئے اور ایسے جکڑے گئے کہ ہل نہ سکتے تھے۔۔۔ اور ہاں، وہ لڑکیاں کس طرح اس کا ہاتھ مَس ہوتے ہی رام ہو جاتی تھیں، بالکل ساکت، ایک دم مردہ، موم کی گڑیا کی طرح، جس طرف مرضی ہے موڑلو، جو چاہے بناڈالو۔ لیکن جلد ہی اس کا یہ گمان بھی ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ کتنی کوشش کے باوجود جب وہ خود کو نہیں پکڑ سکا تو اس کی گرفت میں کوئی کیا خاک رہا ہوگا۔

لیکن یہ سب کیا ہے؟ نہ وہ کسی کی گرفت میں، نہ کوئی اس کی گرفت میں اور نہ وہ خود اپنی گرفت میں۔۔۔ یہ خیال اس کے دماغ کے خلیے چٹ کر گیا۔۔۔ وہ پاگل ہو گیا اور دیوانہ وار ''سب جھوٹ ہے۔۔۔ سب جھوٹ ہے'' کہتے ہوئے۔۔۔ کتابیں زمین پر پٹخنے لگا۔

بالوں کا گُچھا

گزری زندگی معجزانہ انداز میں بُراق پر سوار ہوگئی تھی۔واقعات فلم کی طرح تیزی سے اس کے سامنے دوڑنے لگے تھے۔لمحے سالوں پر محیط ہوگئے تھے۔وہ گھبرا گئی کیونکہ اس نے سُن رکھا تھا کہ موت سے پہلے اسی طرح ہوتا ہے۔اس نے زندگی کی طرف لوٹنے کی غرض سے خود کو جھٹکا دیا۔مہندر سنگھ کی لاش کو اپنی چھاتی اور ہاتھوں کے نیچے محسوس کیا۔اپنے خون آلود ہاتھوں کو اندھیرے میں ڈوبتی آنکھوں سے دیکھا مگر جلد ہی انگ انگ سے اٹھتے درد نے اسے ہولے سے پُرسکون تاریکی میں دھکیل دیا۔گزری زندگی پھر سے گزرنے لگی۔۔۔دھندلی تصویروں میں، رابعہ کو اپنے اور مہندر کے گونجتے قہقہوں میں، اسے بالوں کا گُچھا کہہ کر چھیڑنا، بھاگنا دوڑنا، لڑنا جھگڑنا، کھیلنا کودنا۔آنکھوں تلے پھرنے لگا۔یہ منظر دیکھتے ہوئے اس کے (وحشی دانتوں سے کچکچائے) نیل پڑے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی گئی۔مگر منظر برق رفتار تھے۔جب تک ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی فلم کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی۔مہندر کی ماں اسے سمجھا رہی تھی، ''دیکھ بیٹی! تو میری سگی بھانجی ضرور ہے مگر ہمارے دھرم ہمارے دیش الگ ہیں۔تو اس طرح یہاں نہ آیا کر۔'' فلم کہیں اور پہنچ گئی یا شاید موت کی مشکل نے رابعہ کی آنکھوں میں مہندر سے ملنے کے دشوار راستے گھما دیے تھے۔

کس مشکل سے پہلے وہ اپنے گھر سے نکلتی۔۔۔ پھر مہندر کے گھر کی اُلٹی سمت چل پڑتی، پہلے شاہ صاحب کا گھر، پھر غلام اسحاق کی حویلی، پھر مسجد شریف، پھر رشید کی دکانیں، تب جا کر گلی آتی اور پھر ان دکانوں اور گھروں کے پچھواڑے سے گزر کر سرحد، پھر مہندر کی بستی۔۔۔ گزرنے کا راستہ اسی طرح، پہلے مندر، مندر کے بعد کشور شرما کی حویلی، اس کے بعد شیو سنگھ کا گھر اور اس کے ساتھ بنیوں کی دکانیں، تب جا کر گلی آتی اور ان سب کے پچھواڑے سے گزر کر مندر سے ملا مہندر کا گھر۔ گھر شاید دور نہیں تھے کر دیے گئے تھے۔

کسی قریبی دھماکے نے فلم میں معمولی تعطّل پیدا کیا۔ رابعہ نے اپنی تمام قوتوں کو یکجا کر کے ہاتھ جسم ہلانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ فلم کے رکنے سے اسے احساس ہوا کہ شاید وہ ابھی کچھ دیر زندہ رہے گی۔ اس نے آنکھوں سے منوں ٹنوں وزنی پلکوں کو سرکایا اور لمحے کے کروڑویں حصّے میں اس نے ٹینکوں کے شور میں مہندر کو دیکھا۔ اس کے خاک آلود مردہ چہرے پر ریت کے ذرّے چمک رہے تھے۔ وہ پھر تاریکی میں گم ہو گئی۔ فلم کے آخری سین میں قریب کے واقعات اور زیادہ دُھندلا گئے۔

کل شام بلا کا رن پڑا۔۔۔ رات کا وقت۔۔۔ غیر ملکی فوجی۔۔۔ مسلمانوں کی لڑکی رابعہ۔۔۔ گالیاں۔۔۔ چھینا جھپٹی۔۔۔ ٹینک گولے۔۔۔ مسلمانوں کی ماں۔۔۔ ان کی بہن۔۔۔ شراب۔۔۔ سسکیاں۔۔۔ اذیت۔۔۔ رابعہ نے موت کے بوجھ تلے سے نکلنے کی آخری کوشش کی مگر فلم رک گئی۔۔۔ یا شاید ختم ہو گئی۔

''کیا میں ابھی تک زندہ ہوں؟'' اس مرتبہ وہ اندھیرے کے بجائے روشنی میں ابھرنے لگی۔ اس نے دیکھا وہ اپنے گھر میں ہے۔ ہر چیز روشن ہے۔ ارد گرد زندگی ہی زندگی۔۔۔ رقص کرتی ہوئی۔۔۔ آسمان پر سفید بادل۔۔۔ پرندوں کی ڈاریں۔۔۔

رابعہ: ماں! میں خالہ کے گھر جاؤں؟

ماں: ہاں جاؤ لیکن جلدی واپس آجانا۔

رابعہ گھر سے نکلتی ہے۔۔۔باہر سبزہ ہی سبزہ۔۔۔آنکھوں کو ٹھنڈک دینے والا،
بے تحاشا بے پناہ سبزہ۔۔۔کھیت لہلہاتے ہوئے۔۔۔نہ صحرا۔۔۔نہ ٹینک۔۔۔پہلے شاہ
صاحب کا گھر، پھر غلام اسحاق کی حویلی۔۔۔تازہ مٹی کی خوشبو پھر پچھواڑے سے کشادہ
راستہ۔۔۔پھولوں کے حاشیے۔۔۔جھیلیں۔۔۔نہریں۔۔۔دودھ۔۔۔شہد۔۔۔معطّر
ہوائیں۔۔۔دورویہ سرو کے سیدھے ایستادہ درخت پھر۔۔۔پھر کشور شرما کی حویلی اور شبو
سنگھ کے گھر سے پہلے ہی مہندر سنگھ کے گھر کا راستہ۔۔۔تازہ مٹی کی خوشبو اور وہ سامنے۔۔۔
سفید سفید دانت نکالے، بانہیں پھیلائے۔۔۔بالوں کا گُچھا۔

مرد: (کلاشنکوف میز پر رکھتے ہوئے) تو میرے اخلاق کے قلعہ کی قلماقنی ہو گی۔

لڑکی: (غصے سے) اخلاق تیرے۔۔۔ قلماقنی میں۔۔۔ تو اپنی حفاظت خود کیوں نہیں کر سکتا؟

مرد: اے قاف کی پری! اے قمروش! بڑھتی عمر کا جوش۔۔۔ اخلاق کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تو بدراہ نہ ہو جائے۔

لڑکی: میں اپنے ایمان کی محافظ خود ہوں۔ تو میری فکر مت کر۔

مرد: (نرمی سے) اے فتنۂ قیامت! اے قتالہ! عقد میں قباحت ہی کیا ہے؟

لڑکی: میں نے شادی تجھ بڈھے سے نہیں کرنی، کسی اپنے ہم سِن سے کروں گی۔

مرد: عقد سے انکار گناہ ہے۔ (غصے سے اٹھتے ہوئے) باقی اس سلسلے میں جو قرار و مدار کرنے ہیں ان کا تمہیں حق ہے۔

لڑکی: (نقل اُتارتے ہوئے) حق ہے۔۔۔ عقد۔۔۔ قباحت۔۔۔ حق۔ تو نے کیا "ق" کی رٹ دلگا رکھی ہے؟ یاد رکھ "ق" میں آنکھیں دماغ سے اوپر چلی جاتی ہیں، تابع نہیں رہتیں۔ دماغ سے سوچ کے بات کیا کر۔

مرد: (کلاشنکوف اٹھا کر فیصلہ چاہتے ہوئے) اے لڑکی! حقیقت کو سمجھ اور بول عقد

کرے گی؟ بنے گی قلماقنی؟

لڑکی: مت کہو قلماقنی۔ ان باتوں میں کوئی حقیقت نہیں۔ تم صرف قلبہ رانی کی خاطر تعلق جوڑتے ہو۔۔۔ اُٹھاؤ قسم، بتاؤ حقیقت۔

مرد: اتنی قسادت کا مظاہرہ نہ کر۔۔۔ اس قدر قیل و قال کی ضرورت نہیں۔۔۔ مجھے تیرا تعلق، تیرا ساتھ چاہیے۔

لڑکی: تعلق یا غلامی؟ یعنی عقد ہوا اور تیرا ہر حکم میرے لیے قضائے مبرم بن جائے گا۔ یعنی قبالہ لکھوایا تو تُو آقا میں غلام۔

مرد: (غصّے سے) قطامہ جیسی باتیں مت کر۔ وقت نازک ہے۔ قلتبین ضرور خسارے میں رہیں گے۔

۔۔۔ آ! کہ دونوں پاک رہیں۔ یہی قانونِ فطرت ہے۔

لڑکی: بڑا قانونیا بنتا ہے۔ اس طرح قابو پالے گا مجھ پر؟

مرد: (غصّے سے) قیامت ہے قیامت! اے قتالہ! میں تجھے سنگسار ہونے سے بچانا چاہتا ہوں یاد رکھ یہاں لڑکیوں کا قحط نہیں پڑا کہ میں تمہاری منتیں کر رہا ہوں۔

لڑکی: کس جرم میں تو مجھے سنگسار کروائے گا؟

مرد: (مسکرا کر) سزائیں میں دیتا ہوں (ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر) قانون میرے ہاتھ میں ہے۔ ساری باتیں چھوڑ۔۔۔

(ہاتھ بڑھا کر) میں تجھے عقد کی دعوت دیتا ہوں۔

لڑکی: میں یہ دعوت قبول نہیں کرتی۔

مرد: قبول تو تجھے کرنا پڑے گی۔

لڑکی: نہیں۔

مرد: اے قمروش! ایک پاک تعلق تیرا منتظر ہے۔ مت بن قحبہ۔

لڑکی: میں قحبہ ہوں یا گرہستن۔ تیرے نزدیک کیا فرق؟

مرد: ہے فرق۔

لڑکی: (نقل اُتارتے ہوئے) ہے فرق۔۔۔تو مجھے قرع انبیق سمجھتا ہے کہ میں تجھے پاک کرتی پھروں؟

مرد: سن! یہ قدرت کی تقسیم ہے۔اس میں کوئی قباحت نہیں۔۔۔قربت میں آئے گی تو قرابہ ہوگی، قابلہ ہوگی۔۔۔قابلہ ہوئی تو تیرے پاؤں تلے جنت ہوگی۔

لڑکی: (غصّے سے چیختے ہوئے) تو کیا پیچھے پڑ گیا ہے قرم ساق! قرابہ کیا ہوا۔ قارورہ کیوں نہیں کہتا؟

مرد: کمینی! قحبہ! تیرا منہ ہے کہ قرحہ۔۔۔کیسی قبیح عورتوں والی باتیں کرتی ہے تو۔۔۔

لڑکی: واہ! واہ! واہ! کیا بات ہے۔قحبہ۔۔۔میں قحبہ۔ میرا منہ قرحہ۔۔۔پیپ بہتی ہے اس سے۔۔۔ابھی کچھ دیر پہلے میں قمروش تھی قتالہ اور تیرے اخلاق کی قلماقنی۔۔۔سن موئے، قابوچی! تیری خواہش ہے کہ میں تیرے قوی ہیکل قرنا کو نرماتی رہوں۔۔۔یہی مقصد ہے نا قرابت دار بننے کا؟ لعنت ہو تجھ پر۔ میں یہ قضیہ مول نہ لوں گی۔

مرد: (چانٹا مارتے ہوئے) بند کر بکواس! قینچی کی طرح چلتی ہے زبان تیری۔۔۔قابو میں رکھ اسے بے غیرت!

(بالوں سے پکڑ کر) میں نے عقد کا کہا اور تو لگی اول فول بکنے۔

لڑکی: (روتے ہوئے) تجھ سے عقد؟۔۔۔قسائی کے کھونٹے سے بکری باندھنا ہے۔

(قصاب کے کھونٹے سے بکری کو باندھ دیا گیا۔۔۔کچھ عرصے بعد)

لڑکی: عشاء کے بعد جلدی واپس آجایئے گا۔آپ کو دیر ہوتی ہے تو مجھے فکر ہونے لگتی ہے۔

مرد: (آستینیں نیچے کرتے ہوئے) ٹھیک ہے جلدی آجاؤں گا۔۔۔پاس آتے ہوئے۔۔۔میری تو تجھے اتنی فکر ہوتی ہے۔

ذرا اپنا خیال بھی رکھ لیا کر۔۔۔مسکرا کر۔۔۔کوئی تیل۔۔۔سرمہ؟

لڑکی: (سنجیدہ اور اداس ہو کر) بس! آپ جلدی آجایئے گا۔

خود غرض۔۔۔؟

میں نے زمین سے چپکی قدروں کو پاؤں سے روندتے ہوئے ان کی خواب گاہ میں جھانکنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوگیا۔ وہ دونوں بے تکلف اور بے نیاز مصروفِ کار تھے۔ اس عورت کا بے تحاشا حُسن ایسی لیس میں گُندھا ہوا تھا کہ میری آنکھوں سے چپک کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد ان دونوں نے ایسے پہلو بدلا کہ مداخلت کا خوف قوی ہیکل دیو بن گیا۔ میں نے کچھ دیر وہیں رہنے کی کوشش کی مگر ہٹے بغیر چارہ نہیں تھا۔ سو میں تیزی سے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈنے کے لیے وہاں سے ہٹنے لگا تو زمین کی پھسلن کے باعث منہ کے بل گر پڑا۔ ایک دھماکہ ہوا اور ان دونوں کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اندر سے ایک کرخت آواز گونجی۔ میں نے خود کو بچانے کی کوشش کی اور پھر گر پڑا۔

دوسرے دن جب مجھے ہوش آیا تو وہ عورت میرے زخموں پر مرہم لیپ رہی تھی۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اس کی مدھر آواز نے میرے زخموں میں میٹھا درد بھر دیا، ”تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔ لیٹے رہو۔“ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور اسی خوبصورت حادثے پر سوچنے لگا۔ وہ بستر، جسے دیکھنے کے لیے میں دور کی بستی سے گھنٹوں پا پیادہ چل کر یہاں پہنچا تھا۔ میں اسی پر تھا اور وہ اپسرا میرے پاس بیٹھی تھی۔ ”تم ٹھیک تو ہو نا؟“ میں نے اس کی آواز پر آنکھیں، غلاف سے نکال کر باہر رکھ دیں اور نظروں سے

اس کے چہرے کو سہلاتے ہوئے کہا، ''ہاں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ اٹھ کر چلی گئی۔ کمرہ جیسے خالی ہو گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہر چیز بالکل بے جان تھی، پھر اچانک کمرے کی تمام چیزوں نے لمبا رکا ہوا سانس پھیپھڑوں سے اُگل دیا۔ وہ دودھ کا گلاس میری طرف بڑھا رہی تھی۔ ''یہ لو دودھ پی لو۔'' میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی گلاس اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ اُنگلیوں کی پوروں نے دریافت کے نئے امکان روشن کر دیے۔ میرے ہاتھ ٹھنڈے نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود میں نے گرم گلاس اس طرح دونوں ہاتھوں میں دبایا کہ حرارت مجھے کہیں دور اندر تک محسوس ہوئی۔

اس نے کھڑکی سے باہر وسیع باغ کو دیکھتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں مجھ سے پوچھا، ''کیا تم، چور ہو؟'' مجھے اس کے تلخ تیزابی جملے سے جل بھن کر مسخ ہو جانا چاہیے تھا لیکن پتہ نہیں کیوں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نے بڑے اطمینان سے گرم گرم دودھ کا ایک گھونٹ لے کر کہا، ''نہیں، میں چور نہیں ہوں۔'' اس عورت نے مجھے غور سے دیکھا۔ میرے چہرے پر احساسِ ندامت نہ پا کر وہ مطمئن ہو گئی۔ کمرے کے باہر سے اچانک اس کے شوہر کی آواز آئی ''تو پھر تو یہاں کیا لینے آیا تھا؟'' مجھے اس کی یہ مداخلت کچھ اچھی نہ لگی لیکن اس ڈر سے کہ وہ میری خاموشی کا فائدہ اٹھا کر کہیں اندر نہ آ جائے، میں نے بد حواسی میں وہی جملہ پھر داغ دیا، ''میں۔ چور۔ نہیں۔ ہوں۔'' یہ جملہ میں نے اس طرح لفظ چبا چبا کر ادا کیا کہ اسی دوران میں دوسرا مناسب جملہ اس پہلے جملے سے منسلک ہو گیا۔ ''میں تو راستہ بھول گیا تھا۔'' اس دوسرے جملے نے مجھے تحفظ کا احساس تو دیا مگر کمرے میں ہم تین ہو گئے اور تیسرے کا دکھ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میرے کھلے زخم درد سے اَٹ گئے اور اس کمبخت کا منہ سوالوں سے۔ جب بھی کوئی جواب وقت کا تقاضا کرتا تو میں اتنی دیر تک زخموں کی اوٹ میں چھپا رہتا تھا۔ اس خبیث کی ہر تان ایک ہی بات پر ٹوٹتی کہ آخر میں ان کی تنہائی میں کیوں مخل ہوا تھا؟؟؟ اسی ایک بات کی رَٹ میں وہ مسلسل وہی غلطی کیے جا رہا تھا۔ جو غلطی مجھ سے نادانستہ ہو گئی تھی۔

کیچڑ

ضیغم کو ابھی تک اپنی سفید پوشی پر ناز تھا۔ وہ اس رواج کی بھینٹ نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔ ابھی تو اسے اپنے باپ دادا کے اجلے کپڑوں کو اور بھڑک دینا تھی جن کا وہ عینی شاہد رہ چکا تھا۔ وہ خود کو اس تہذیب کا پاسبان سمجھتا تھا۔ ان دنوں مسئلہ یہ تھا کہ رواج کے منہ زور سیلِ بلا کے سامنے اس کی دلیلیں بھونڈی اور بھدّی ہو کر مذاق بن گئی تھیں۔ سو اس نے گھر سے نکلنا کچھ کچھ کم کر دیا تھا۔

ان دنوں کیچڑ میں لت پت ہونا رواج ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے کج کلاہ، سینوں پر تمغوں کی طرح دھبے سجائے پھرتے تھے۔ حضرت، مولانا، صاحب اور مِسٹر، جن کے قدم رکھنے کا انداز خاصا محتاط ہوا کرتا تھا۔ پتا نہیں کیوں عین چوک میں غیر محتاط ہو جایا کرتے تھے؟ سفید پوشی باعثِ ننگ ہوئی جاتی تھی۔

عورتوں میں دیکھا دیکھی چونکہ مردوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہوا کرتی ہے۔ ان میں جو کیچڑ سے بال رنگنے کا کام شروع ہوا تو ابٹنوں اور کریموں سے لے کر کاجل اور لِپ سٹک تک مٹیالی ہو گئی۔ ضیغم کی عمر کچھ ایسی تھی کہ اس کو حسن و جمال کائنات کی کسی شے میں دکھے نہ دکھے، عورت میں ضرور نظر آتا تھا۔ اس رواج نے اس کی آوارگی تک کو میلا کر دیا تھا۔ وہ بظاہر ابھی کمزور نہیں پڑا تھا۔ لیکن کہیں دور اندر ہی اندر شکست و ریخت

شروع ہو چکی تھی۔ ہر نیا دن ایک جوشیلے سیلابی ریلے کی طرح گزر جاتا تھا۔ ضیغم کی دلیلوں میں غصہ اور غصے میں گالیاں در آئی تھیں۔

وہ اس وقت چلا اُٹھتا تھا جب کوئی کل کا لونڈا، بیچ بازار پھسلتا اور قبیلے کی آنکھ کا تارا بن جاتا تھا۔ اس کا نام اخباروں میں اس کی تصویروں کے ساتھ چھپتا، ٹی وی پر اس کے انٹرویو چلتے۔ تاریخ دان اس کے پھسلنے کا انداز خاکی روشنائی سے لکھتے، لڑکیاں ڈھولک کی تھاپ پر اس کے نام کے ماہیے گاتیں۔ بھانڈ چوراہوں میں اس کے قصیدے پڑھتے تھے۔

ضیغم کبھی قبیلے کی آنکھ کا تارا ہوا کرتا تھا۔ بزرگ اس پر فخر کرتے تھے۔ کمزور اور ضعیف اسے اپنا سہارا سمجھتے تھے۔ قبیلے کی لڑکیاں اس کے گیت گاتی تھیں۔ آج وہ ناکارہ پرزے کی طرح تنہا پڑا تھا۔ وہ اکثر سوچتا تھا۔ کل تک کتنے لوگ تھے جو اس بھونڈے رواج پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ آج وہ سب کے سب اس طغیانی کی نذر ہو گئے تھے۔ اب وہ اکیلا تھا۔ جوان تُند و تیز لہروں کے تھپیڑے سہ رہا تھا۔

وہ یہ سوچ کر بہت کُڑھتا تھا کہ کیسے یہ پایاب دیکھتے ہی دیکھتے سرِیاب ہو گیا تھا۔ کس طرح پہلے پہل لوگوں نے محفلوں میں بیٹھ کر اپنے پھسلنے کے قصے سنانے شروع کیے۔ اُس زمانے میں ان کے چہروں پر شرمندگی کے آثار بہت نمایاں ہوا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ آثار عنقا ہو گئے اور قصے شجرۂ نسب کے ساتھ پیش ہونے لگے۔ پھر اخباروں اور ٹی وی کا حصہ بنے اور دیکھتے ہی دیکھتے کس سلیقے سے مذہب اور اَدب کی زینت بن گئے تھے۔

ہمارے محققین جو بال کی کھال اتارنے کے ماہر ہیں۔ انھیں تو موقع ملنے کی دیر تھی۔ پھر کیا تھا۔ کسی نے یونانیوں اور مصریوں اور سومیریوں کی معاشرت سے مثالیں کشید کیں۔ بعض صاحبانِ علم، نینڈرتھل کے خون کے تجزیے اٹھائے، بندروں کی مہین نسلوں سے ہوتے ہوئے، کائی تک کو جانچ آئے۔ کچھ باریک بینوں نے سورج کی حدت اور

برفانی ادوار سے وہ گنگا جمنی کیفیت پیدا کی کہ الاماں! ہمارے کچھ مشرق پرست دوست، موہنجوڈارو اور کوٹ ڈی جی سے جنگی اوزار اٹھائے رزم گاہ میں آداخل ہوئے۔
مذہبی مہربانوں نے قدیم صحیفوں کی چھان پھٹک کی تو نٹیالے نور سے دنیا جگمگ جگمگ کرنے لگی اور رواج کے پیکر نے روایت کا چولا پہن لیا۔
ضیغم جو پہلے ہی گھر سے کم نکلتا تھا اب کمرے تک محدود ہو گیا تھا۔ پسپائی اسے چارپائی تک لے گئی تھی۔ اُجلے پن کا فخر احساسِ کمتری میں بدل گیا تھا۔ گھر والوں کی صلاح تھی کہ وہ زیادہ دیر مہمانوں میں نہ بیٹھا کرے۔ بقول ان کے ضیغم سفید اجلے کپڑوں میں عجیب اُوٹ پٹانگ سا لگتا ہے۔
اس کے دوستوں میں سے اب ایک دو ہی باقی بچے تھے جو کبھی کبھار اس سے ملنے آجایا کرتے تھے۔ انھوں نے اب ضیغم کو ابوجہل کہنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کی گفتگو میں طعنے اب بہت کم ہو گئے تھے۔ یہ کام وہ صرف طنزیہ مسکراہٹ سے لے لیا کرتے تھے۔ ان کی زہرناک مسکراہٹوں سے ضیغم کے ماتھے پر ننھی ننھی بوندیں ابھر کر چہرے کی شرمندگی دھونے کی ناکام کوشش کرتی تھیں۔
۔۔۔سیلاب کے آگے کس کا بس چلا ہے۔۔۔
بالآخر وہ ہار گیا۔ اس نے فیصلے کی ٹھان لی۔ فیصلے کے لیے اُسے کچھ وقت درکار تھا۔ اُس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ ایک عرصے تک خود سے لڑتا رہا۔۔۔ پھر ایک دن اُس نے کٹھن فیصلہ کر لیا۔۔۔ سفید پوشی باعثِ ننگِ اَسلاف ہے۔۔۔ دنیا میں رہنے کے لیے کیچڑ میں لت پت ہونا پڑتا ہے۔۔۔ آخر اِس خاک سے ہمارا خمیر اُٹھا ہے۔۔۔ خاکی رنگ میں برائی ہی کیا ہے؟۔۔۔ اُس نے چمکتا سفید لباس پہنا۔۔۔ دیوانہ وار کمرے سے نکلا۔۔۔ اِرد گرد سے بے نیاز۔۔۔ بیچ بازار کیچڑ میں ایسا پھسلا کہ اُس کا لباس مٹیالا ہو گیا۔۔۔ اُس نے فخریہ انداز میں۔۔۔ خوشی خوشی اِدھر اُدھر دیکھا۔۔۔ لوگ بدبودار نالوں کی مٹی میں لتھڑے سیاہ لباس پہنے اس پر ہنس رہے تھے۔۔۔ رواج بدل چکا تھا۔

حیاتِ جاوید

پروفیسر نے بھیڑ بھاڑ میں اسے دیکھ لیا تھا۔ سرو قد، سفید رنگت، مضبوط بانہیں، خوب موٹے تازے ہاتھ، چوڑی گلابی ہتھیلیاں، چپٹے پاؤں، ٹانگیں گوشت سے بھرپور، کشادہ شانے، روشن پیشانی، بھرے ہوئے گال، ابھرے ہوئے ہونٹ۔ آنکھیں چھوٹی مگر تیز اور گھومتی ہوئیں۔ گردن کی گوٹی ڈھیلی ڈھالی یعنی سر، آنکھوں کے اشاروں پر دائیں بائیں حرکت کرتا ہوا۔

اس دن وہ کاموں کے انبار تلے دبا ہوا تھا۔ تصویروں کی نمائش، عالمی مندوبین کا استقبال، پیپر کا پڑھنا وغیرہ وغیرہ۔ مصروفیتوں کے کوہِ گراں میں ایسے آبجیکٹ کا مل جانا اس کے لیے مزید سرشاری کا باعث تھا کیونکہ وہ کام سے بہت خوش ہوتا تھا۔ کام اور بے حساب کام، جو دن وقت گزرنے کا احساس دلائے بغیر بیت جاتا وہ اس کے لیے عید کا دن ہوتا تھا۔ اس کی نسوں میں جلد بازی دوڑتی تھی۔ وہ سالوں کی مسافت لمحوں میں طے کرنے کا عادی تھا اور ایسے ہی لوگ انتہا پسند ہوتے ہیں۔

ان دنوں وہ ایسا ہی کردار تلاش کر رہا تھا۔ بہت عرصے سے کوک شاستر قسم کی جنسی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ ایک جیتے جاگتے کردار کا متلاشی تھا۔ ایک بے رحم کردار، جس کا اندر اس طرح جسم پر چھلکتا ہو کہ شک کی گنجائش نہ رہے۔ پروفیسر اسے

کھو جنا چاہتا تھا ساری پرتیں اتار کر، روزِ روشن کی طرح عیاں، اتنا واضح، یوں کھلا ہوا کہ کردار خود بولے کہ، "میں یہ ہوں۔" وہ اس سے پہلے بھی کئی کردار کھول چکا تھا۔ پروفیسر انتہائی سنگ دل، مطلبی اور ظالم تھا۔ چیر پھاڑ سے جھر جھری بھی نہ لیتا تھا۔ پورا قصائی تھا۔ ہمدردی، محبت اور خلوص نام کی کوئی شے اسے کردار سے دور نہ کر سکتی تھی۔ وہ ظاہر کو جانچتا، اندرون کا معائنہ کرتا۔ نوکیلے نشتروں سے چھیلتا۔ جیتے جاگتے، چیختے چلاتے کو کھول کھال کر رکھ دیتا لیکن اس سفاکی کے بعد آبجیکٹ کی عین تصویر کینوس پر منتقل کرتا کہ مزہ آجاتا تھا۔ اس کا کام ہی کچھ ایسا تھا۔ وہ زندہ لوگوں کو آبجیکٹ کہتا تھا۔ آبجیکٹ یا گنی پگ!!! اسے انسانوں سے نہیں صرف ان کے اس عکس سے دلچسپی تھی جو اس کے کینوس کی زینت بنتے تھے۔ کام میں مشغول، بھاگتا دوڑتا، لوگوں سے ملتا، دھیان آبجیکٹ پر اس کی ہر جنبش نوٹ کرتا ہوا۔ جنسیاتی کتابوں کے جملوں سے ملاتا۔ خدوخال، جنبش، لہجہ وغیرہ وغیرہ۔

کمبخت گھیرنے میں بہت ماہر تھا۔ وہ مکڑی صفت تھا۔ ایسا جال بنتا تھا کہ تتلیاں پَر نہ پھڑ پھڑا سکتی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ پر ہلا دیں تو ان کے رنگ اتر جاتے ہیں۔ تصویر ادھوری رہ جاتی ہے۔ پروفیسر کوئی خوبصورت یا جاذبِ نظر نہیں تھا۔ عام سا چہرہ درمیانہ قد سانولی رنگت لیکن وہ تانے بانے ایسے مضبوط بُنتا تھا کہ بڑے بڑے ہیرو مات کھا جاتے تھے۔ پھر وہ ہارے ہوئے سورماؤں کو بڑے فخر سے دل جیتنے کے گُر بتاتا تھا، "دیکھو! زبان، سماعت، حافظہ اور وقت یہ چار عناصر ہوں تو۔۔۔۔ محبوب آپ کے قدموں میں۔ تم ناکام ہوئے صرف اس وجہ سے کہ اپنے حسن پر نازاں رہے۔ دولت کی چمک دکھائی۔ مردانگی، انا، مصروفیت وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب فضول ہے۔ ایک دم بے کار۔ سو آبجیکٹ بھاگ گیا۔ قصہ ختم ہوا۔ مجھے کامیابی اس لیے ہوتی ہے کہ میری زبان، تعریف میں گندھی ہوئی ہے۔ میرا سارا وقت آبجیکٹ کا ہے، اسے سننا، اتنا سننا کہ وہ سب اگل دے۔ میں اس کے ذہن کا اگال دان بن جاتا ہوں۔ اس کی ہر بات یاد رکھتا ہوں۔ اتنی چھوٹی سے چھوٹی بات کہ وہ پاگل ہو جائے۔ جیسے میں اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا۔"

پروفیسر کی یہ باتیں بالکل بکواس تھیں۔ اصل کہانی یہ نہیں تھی جو وہ بتاتا پھرتا تھا۔ سیدھے سبھاؤ بات اتنی سی تھی کہ لوگ محبت یا جنسی کشش محسوس کرتے ہوئے دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ اپنی عزت بچا کر چلتے تھے۔ اسے نہ اپنی غیرت کی پرواہ نہ دوسرے کی عزت عزیز۔ اس کے لیے جیتے جاگتے لوگ آبجیکٹ تھے۔ وہ محبت، جنسی کشش محسوس تو کرتا تھا مگر ثانوی سمجھ کر۔ اس قوت کو وہ اپنے رنگوں، برش اور کینوس کی سمت موڑے رکھتا تھا۔ آبجیکٹ کا اندر اس کے خدو خال میں چھلکے اسی میں اس کی عزت تھی۔ بے جان نقش کو لاشعور کی کال کوٹھڑی سے رنگ لا کر ابدی زندگی دینا آبجیکٹ پر احسانِ عظیم تھا۔ یہی اس کا آبجیکٹ سے عشق تھا۔ اس خود غرض پروفیسر کا عقیدہ تھا کہ قلوپطرہ کی مسکراہٹ کو قید کرنے والے پر اس کا خون معاف تھا اور وہ اس لیے کہ مصور نے اسے وہ طویل اور پرمسرت زندگی عطا کر دی تھی۔ جو کوئی دیوتا یا خدا بھی نہیں دے سکتا۔ سو اس بے رحم کے لیے جیتا جاگتا انسان آبجیکٹ تھا اور بس!!! سو یہ کامیاب ہو جاتا تھا۔

وہ ابھی آبجیکٹ تک رسائی کا طریقہ سوچ رہا تھا کہ خود وہ فوٹو گرافر لڑکی اس تک آگئی۔ ''اچھا تو آپ آرگنائیزر ہیں؟'' لڑکی نے جان بوجھ کر استفہامیہ لہجہ اختیار کیا۔ پروفیسر کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ نہ جال بچھایا نہ دانہ ڈالا۔ اس کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ مکڑی نے تانے بانے کیا بننے تھے۔ تتلی خود لوٹ پوٹ ہو کر جال اپنے اوپر کسنے لگی۔ واہ جی واہ! وہ مست ہو کر دریافت کی منزلیں طے کرنے لگا۔ یہ چار عناصر ہوں تو۔۔۔ کمبخت جلد باز تھا۔ بتایا تھا نا! کہ جلد بازی اس کی رگوں میں دوڑتی تھی۔ سالوں کا سفر لمحوں میں طے کرنے کا عادی تھا۔ یہ بات وہ بھول گیا تھا کہ آسان شکار دیکھ کر تو بھوکا شیر بھی کچھ لمحوں کے لیے رک جاتا ہے۔

پروفیسر کینوس کے سامنے رنگ سجائے، برش اٹھائے ساکن کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر لاشعور کے نہاں خانوں کا عکس اتنا واضح تھا کہ مزہ آگیا۔ یقین جانو! وہ اپنی اس تصویر میں اَمر ہو گیا تھا۔ فوٹو گرافر لڑکی بہت سفاک قاتل تھی لیکن اب پروفیسر اُس سے خون بہا کا تقاضا نہیں کر سکتا تھا۔

کشاف العیوب

آج میں یہ سوچے بغیر اپنے عزیزوں کی لاشوں کے پاس کھڑا ہوں کہ اگر کوئی ساتویں منزل کے ٹیرس سے نیچے دیکھے گا تو میری کیا حیثیت رہ جائے گی؟ آخران لاشوں کی پستی یا ٹیرس کی باریک دیوار کی بلندی سے میری حیثیت کا تعین کیسے کیا جا سکتا ہے؟؟؟

بچپن میں چھوٹے بھائی کے ساتھ، ساتویں منزل کی ٹیرس پر کھیلتے ہوئے وہ اچانک گرنے لگی تھی۔ باریک دیوار، زندگی اور موت کے بیچ حائل ہوگئی تھی۔ اونچائی کے خوف نے اسے چند لمحوں کے لیے ساکت کر دیا تھا۔۔۔ اتنی بلندی۔۔۔ اس قدر اونچائی۔۔۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے پہلی مرتبہ زمین کو اس فاصلے سے دیکھا تھا جس سے آزاد پرندے دیکھتے ہیں۔

جب ذرا سنبھل گئی تو پھر سے کھیلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر دھیان تھا کہ بار بار ٹیرس سے لڑھک جاتا تھا۔۔۔ وہ حیران تھی۔۔۔ خوف میں اتنی کشش بھی ہو سکتی ہے؟؟؟ ۔۔۔ وہ دوبارہ اسی طرح گر کر سنبھلنا چاہتی تھی۔ اب کی بار اس نے جان بوجھ کر گرنے کی ایکٹنگ کی۔ کچھ دیر باریک دیوار کا سہارا لے کر نیچے دیکھتی رہی۔ اونچے درخت اور لمبے تڑنگے، مضبوط، کشادہ کندھوں والے مرد (جن سے وہ انجانا خوف محسوس کرتی تھی) بالکل

بونے نظر آرہے تھے۔

اس گرنے کی ایکٹنگ میں اسے بالکل بھی خوف محسوس نہ ہوا۔۔۔نڈر ہونا۔۔۔ اسے عجیب بے لذت محسوس ہوا۔خوف میں کمی نے اسے حیرت انگیز طور پر بے چین کر دیا تھا۔وہ کھیلنا بھول گئی تھی۔ایک نامانوس بے قراری میں وہ ٹیرس پر ٹہلنے لگی تھی۔اضطراب بڑھنے لگا۔۔۔اور بڑھنے لگا۔۔۔جب حد سے سوا ہو گیا۔۔۔تو اچانک جیسے اسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔۔۔وہ بھاگی اور دیوانہ وار اُچھل کر ساتویں منزل کے ٹیرس کی باریک دیوار پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔۔۔کچھ لمحوں بعد اسے بچ جانے کا احساس ہوا۔۔۔تو اسے خوف نے اپنی مضبوط بانہوں میں بری طرح کس لیا تھا۔اس کساؤ میں لذت کے وہ چشمے پھوٹ رہے تھے۔جن سے وہ پہلی دفعہ آشنا ہو رہی تھی۔دھڑکنوں کی شدت سے دل پھٹا جا رہا تھا۔رواں رواں لرزنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں جسم غیر متوازن نہ ہو جائے۔پھیپھڑوں میں سانسیں پتھر کی ہو رہی تھیں۔ماتھے کی نسیں دھک دھک کرنے لگی تھیں۔لُپلپانے کا عمل، کھلے زخم کی تکلیف، ہڈیوں کے چکنا چور ہونے کا احساس۔۔۔موت۔۔۔قبر کی دراڑ میں اکڑا ہوا لاشا۔۔۔

بھائی نے پاگلوں کی طرح بھاگ کر اسے کھینچ لیا تھا۔وہ دھڑام سے ٹیرس پر گر پڑی تھی۔پھر دیر تک فرش پر نیم دراز ہنستی رہی تھی۔۔۔پہلی بار اس کا مکمّل جسم۔۔۔اس کا ہر عضو۔۔۔اس کے ساتھ مل کر قہقہے لگا رہا تھا۔بہادری اور فتح کی تسکین اس کے آخری خلیے تک کو سیراب کر رہی تھی۔

شاید ایک حالت میں رہ کر شوق سے بار بار لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔پہلو بدلنا پڑتا ہے۔ذرا سنبھلی تو پھر باریک دیوار پر کھڑی ہو گئی۔۔۔خوف میں کمی کے احساس پر اس نے چلنے کی کوشش کی۔۔۔خوف نے پھر جادو جگایا۔۔۔اونچے درخت۔۔۔کشادہ شانے۔۔۔سب پاؤں میں۔۔۔سب زمین پر ایسے نقش تھے جیسے اس کی بیڈ شیٹ پر پھول پرنٹ ہوتے ہوں۔اب کی بار، بھائی چلایا تو باپ ٹیرس پر آ گیا۔باپ کی شدید محبت

وحشت میں بدل گئی۔اس نے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا، بے دردی سے مارا پیٹا۔

اس نے اپنے بچپن کا یہ عجیب و غریب واقعہ مجھے کئی بار سنایا تھا۔ ہر بار ایسے جوشیلے انداز میں کہ اس کی سانسوں کی ترتیب بدل جاتی تھی۔ چہرہ متغیر ہو جاتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بازو ایسے دبانے لگتی تھی جیسے باپ کی وحشیانہ مار پیٹ کے بعد بدن سہلا رہی ہو۔

میری ملاقات اس سے اتفاقیہ ہوئی تھی۔ لیکن پہلا ہی دن صدیوں کے یارانے پر محیط ہو گیا تھا۔ وہ بندھن کہ نہ دیکھا نہ سنا۔ ایک دلدل تھی، جس سے نکلنے کی کوشش میں ہم مزید دھنستے چلے جاتے تھے۔ یارانہ بھی عجیب احمقانہ قسم کا تھا۔ ہم دونوں نے اپنا ہر کچا چٹھا ایک دوسرے کے آگے یوں طشت از بام کر دیا۔ جیسے ہم ایک دوسرے کا آئینہ ہوں۔

تعریفیں تو عشق و محبت میں سب کرتے ہیں۔ ہم پہروں بیٹھ کر ایک دوسرے کی برائیوں کا نفسیاتی تجزیہ اس سچے، کھرے اور بے ہودہ انداز میں کرتے تھے کہ الاماں ! شاید ایک دوسرے کو اذیت دے کر ہم لذت محسوس کرنے لگے تھے یا جو بھی تھا لیکن اس فضول بحث و تکرار کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ مجھے اس سے عشق تو تھا ہی، اب اس کی برائیوں سے بھی عشق ہو گیا تھا۔

خصوصاً اس کی دو برائیوں سے۔۔۔ جن سے پہلے مجھے شدید نفرت ہوا کرتی تھی۔ پتا نہیں کیسے، ہمدردی، ترس، معصومیت اور محبّت کا یہ ملغوبہ عشق میں بدل گیا۔

وہ بلا کی جھوٹی تھی۔ اس کے نزدیک صرف جھوٹ کو مان لینا ہی جھوٹ ہوتا ہے۔ کوئے کی سفیدی پر قسمیں چپکا لی جائیں تو سانچ کو آنچ کہاں؟ سو اس کے جھوٹ میرے لیے معصوم بچوں کی کلیلوں اور شرارتوں سے زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ جب شدید خواہشات کو مروجہ اخلاقی سہارا نہ ملے تو جھوٹ سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں ہوتی۔

دوسری بری عادت۔۔۔ جان بوجھ کر ایسی غلطیاں کرنا تھا کہ نوبت ڈانٹ

ڈپٹ سے مار پیٹ اور اذیت رسانی تک آجائے کیونکہ اس کے لیے خوف، زخم اور منت سماجت میں لذت کے ہزار ہا رنگ اور ہزار ہا پہلو موجود تھے۔

الغرض وقت کی طغیانی میں اتفاق کی لہروں نے ہمیں ایسا یکجا کیا کہ وہ حلقۂ یاراں میں داخل ہو گئی۔۔۔ حلقۂ یاراں۔۔۔ جو بہت محدود تھا۔۔۔ چند چنیدہ لوگ۔۔۔ میرے بہت خاص۔۔۔ جان سے عزیز۔۔۔ جن سے میری شناسائی، اس کی پیدائش سے بھی کہیں پہلے کی تھی۔ ہمارے اعتماد کی اینٹوں سے چُنی دوستی کی دیوار بہت اونچی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ جب ایسی فضول دیوار آسمان سے باتیں کرنے لگے تو وہ تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہو جاتی ہے۔

وہ آج بھی میری دوست ہے اور زندہ ہے۔ میں آج بھی اس سے عشق کرتا ہوں۔۔۔ اگر یہ کہوں کہ وہ دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ہے اور مکمّل حُسن کا پیکر ہے تو یہ جھوٹ ہو گا۔۔۔ اور اگر یہ کہوں کہ اس میں کوئی معمولی سی بھی کمی ہے تو یہ یقیناً جھوٹ ہو گا۔ سو آج بھی وہ مجھے عزیز ہے کیونکہ اسے فلک بوس باریک دیوار پر چلنے کا فن آتا ہے۔ افسوس تو مجھے اپنے ان دوستوں پر ہوتا ہے جو اس فن میں بالکل اناڑی تھے۔

آج میں یہ سوچے بغیر اپنے عزیزوں کی لاشوں کے پاس کھڑا ہوں کہ اگر کوئی ساتویں منزل کے ٹیرس سے نیچے دیکھے گا تو میری کیا حیثیت رہ جائے گی؟ آخر ان لاشوں کی پستی یا ٹیرس کی باریک دیوار کی بلندی سے میری حیثیت کا تعین کیسے کیا جا سکتا ہے؟؟؟

مذاق

جب مجھے روشنیوں اور نور کے ہالوں کے درمیان معلق تخت کے سامنے لایا گیا تو میرے چاروں اُور باسی گارے اور تازہ گوشت کی بھینی بھینی خوشبو ابھی باقی تھی۔۔۔ پھر مجھے مسجودِ ملائک قرار دے کر یوں بکھیڑوں میں ڈالا گیا کہ میں متنازِعہ ہو گیا۔۔۔ خدا اور شیطان میں بحث و تکرار ہوئی۔۔۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان مجھے اور میری اولاد کو ورغلائے گا۔ جب کہ خدا نے میری کامیابی اپنی اطاعت میں رکھی۔۔۔ سو میں میدانِ جنگ بنا۔۔۔ میرے لیے دو مقام وجود میں آئے۔ ایک جنت اور دوسرا جہنم۔

خدا جو میرا خالق تھا۔ مجھ پر کچھ زیادہ ہی بھروسا کرتا تھا سو اس نے میری ہی پسلی لے کر میری آزمائشوں میں اضافہ کر دیا۔

مٹی سے آدم ہونا تھا کہ میں متنازعہ ہو گیا، میری آزمائشیں بڑھتی گئیں اور میں ہارتا چلا گیا۔ جب میں جنت میں اپنی بقا اور دائمی اقتدار کی جنگ ہار گیا، تب بھی میرے مالک کو میری قوتوں پر شک نہ ہوا۔ مجھے پھر ایک موقع دیا گیا۔ شاید آخری تھا۔ ایک ویران سیارہ میرا مقدر بنا دیا گیا۔۔۔ میرے دونوں دشمن۔۔۔ یعنی میری عورت اور شیطان۔۔۔ اس ویرانے میں میرے ساتھ اتار دیے گئے۔ میں، میری عورت اور شیطان، تینوں ایک مثلث کے زاویے تھے۔

عورت میری آنکھوں کو تراوت بخشتی۔۔۔اس کے چھونے سے میرے جسم میں عجیب کشمکش پیدا ہو جاتی، رگوں میں خون دوڑنے لگتا اور دوڑتے دوڑتے یوں سرپٹ ہو جاتا کہ میری سانسیں سنگت نہ کر پاتیں۔وہ طغیانی اٹھتی کہ جنت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہیچ ہو جاتی اور جہنم سرد۔

شیطان وہ کم بخت تھا۔جو چھپا رہتا تھا۔کبھی تو ہواؤں میں تحلیل رہ کر مجھے گمراہ کرتا، کبھی میرے جذبوں کی پنہائیوں میں دبکا ساز باز کرتا رہتا۔ میں ان دونوں سے خوف زدہ رہنے لگا کیونکہ مجھے ابھی اپنی پہلی شکست یاد تھی۔ابھی سیارے پر آئے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ میں پریشان ہو کر اندر سے ٹوٹنے لگا۔اس سے پہلے کہ میں اپنی عورت کے قریب جاتا۔اس سے پہلے کہ میری عورت پر وہ نشہ طاری ہوتا کہ وہ دردِ حمل کو بھول کر سپردگی کی مدہوشی میں ڈوب جاتی اور اس سے بھی پہلے کہ شیطان مجھ پر کوئی وار آزماتا۔ میں گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔عالمِ استغراق میں کروڑوں اربوں لوگوں کو دکھوں، بیماریوں اور موت کے پرہول غاروں میں گم ہوتے دیکھنے لگا۔جن کا دوسرا سرا بچھوؤں، سانپوں اور آگ کے کنوؤں میں گرتا تھا۔ان سب کا انفرادی دکھ دیکھ کر میرا دکھ اجتماعی ہوتا چلا گیا۔آخر سب میری اولاد ہی تو تھے۔

میری کشمکش بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی کہ میں نے اس مثلث کو توڑنے کا منصوبہ بنانا چاہا۔اپنے دشمنوں کو مات دینے کے کئی طریقے سوچے لیکن بہت زیادہ غور و خوض کے بعد میں نے مثلث کے دو زاویوں کو بہت ہی مضبوط پایا۔

شیطان چھپا ہوا، نظر نہ آنے والا دشمن تھا۔ویسے بھی وہ جنت جیسے مضبوط قلعے میں ہمیں شکست دے کر اپنی دھاک بٹھا چکا تھا لہٰذا مثلث کا یہ زاویہ میری قوت سے کیا میری سوچ سے بھی کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔

مثلث کا دوسرا زاویہ یعنی میری عورت۔۔۔جو بظاہر کانچ سے زیادہ نازک تھی مگر جب میں اس کے قریب ہوتا تو میرا غیظ و غضب، میری طاقت اور سختی یکسر لطافت

میں بدل جاتی چنانچہ وہ میری لطافت کے مقابلے میں شیطان سے کہیں زیادہ مضبوط اور توانا تھی۔

سو اس مثلث کا آخری زاویہ میں خود تھا اور یہی دیوار مجھے کمزور محسوس ہوئی۔ میں نے تھکا دینے والی کشمکش اور طویل غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ پرائے جھگڑوں سے مجھے کیا لینا دینا؟ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے میدانِ جنگ بننے کی؟ لہٰذا میں ایک تازہ جوان پیپل کے درخت کے نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور دماغ کو سوچوں سے آزاد کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ میری عورت میرے سامنے رقص کرتے کرتے تھک گئی۔ وہ نڈھال ہو کر گر پڑی اور شیطان اپنے تمام داؤ پیچ آزما کر ہار گیا۔

مجھے نہیں معلوم خدا، فرشتوں اور میری عورت نے میرے بارے میں کیا سوچا؟ اور کیا کہا؟ لیکن میں نے تھکے ہارے شیطان کے یہ الفاظ ضرور سنے تھے، ''یہ بے ایمانی ہے! آدم کے پیکر میں گوتم کی روح رکھ کر مقابلہ کرنا کھیل کے اصولوں کے خلاف ہے۔ یہ سراسر مذاق ہے۔''

پس ارتقا

"ہیلو!!۔۔۔تم سن رہے ہو نا!۔۔۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا۔اس لڑکی کے نشے کی۔۔۔کہ میں نے دو ڈھائی سالوں میں، سوائے آخری مرتبہ کے، کبھی اس پر نشہ طاری ہوتے نہیں دیکھا۔۔۔ ہاں ہاں وہ جس قدر بھی پی جائے، شراب اس پر اثر نہیں کرتی تھی۔۔۔تم منیب سے پوچھ لینا۔۔۔ یہ شروع شروع کی بات ہے۔ وہ ہمارے دیکھتے دیکھتے مری بروری کی آدھی پونی بوتل بالکل نیٹ چڑھا گئی۔۔۔ ہاں ہاں بالکل نیٹ۔۔۔قسم سے تم منیب سے پوچھ لینا۔۔۔ پھر ہم دونوں تو اس رات اتنے ڈر گئے تھے کہ نہ پوچھو۔۔۔ تمہیں تو پتا ہے منیب کے کمرے کا۔وہاں سے تو ذرا سی آواز پورے محلے میں سنائی دیتی ہے۔۔۔سن نا! ہمارا خیال تھا کہ ابھی یہ نشے میں دھت ہو کر غل غپاڑہ کرے گی۔۔۔شور شرابا ہوگا لیکن پتا ہے کیا ہوا؟۔۔۔اس کی پلکیں ذرا سی بوجھل ہوئیں اور تھوڑی سی آواز بھاری ہوگئی۔بس!۔۔۔ ہاں ہاں قسم سے باقی وہ بالکل اپنے حواس میں رہی ذرا سا فرق نہیں پڑا اس حرامزادی پر۔۔۔ہاں نا! بلکہ وہ تو ایک اور بوتل کا تقاضا کرتی رہی تھی لیکن تم تو منیب کو جانتے ہو۔ بہت کنجوس آدمی ہے۔ خسیس ٹال گیا اسے۔ یہ تو صرف ایک واقعہ تھا۔ میری میل ملاقات اس سے کوئی دو ڈھائی سال تک رہی تھی۔ یقین جانو! کہ سوائے آخری مرتبہ کے میں نے کبھی اس پر نشہ طاری ہوتے نہیں دیکھا اور

یہ آخری مرتبہ جو اس پر نشہ طاری ہوا تھا اس کی بھی شاید ایک وجہ تھی۔ وہ وجہ ہماری بہت زیادہ قربت اور دوستی تھی۔۔۔ او بتاتا ہوں نا۔ تمہیں تو پتا ہے اس فیلڈ کا، یہاں تو بس لے گئے، دھکم پیل ہوئی اور یہ جا وہ جا۔ ایسی عورتوں سے تو دوستی کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن میں اس زمانے میں عشق کی ناکامی اور بے روزگاری کی وجہ سے خاصا ٹینس رہا کرتا تھا۔۔۔ ہاں وہی زمانہ۔۔۔ اور وہ بھی کوئی ایسی خوبصورت تھوڑی تھی کہ گاہکوں کی قطاریں لگی ہوں۔ بس میں اکثر اس کی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ بس چند طویل ملاقاتوں میں ہماری دوستی ہو گئی۔۔۔ ایک حیرت انگیز بات بتاؤں تمہیں؟۔۔۔ تو سنو! تم یہ سن کر بھی حیران ہو جاؤ گے۔ جس دن اس نے دوستی کا اعلان کیا تھا اسی دن سے اس نے پیسے لینے بند کر دیے تھے۔ بہت حرامزادی تھی۔۔۔ ہاہاہاہا۔۔۔ پتا ہے کیا کہتی تھی؟۔۔۔ کہتی تھی، ''پورے شہر میں ایک پرمننٹ گاہک بنایا تھا۔ اس بہن۔۔۔ سے بھی اپنی بھائی بندی ہو گئی۔ میں خاک کاروبار کروں گی''۔۔۔ ہاہاہاہاہا۔۔۔ قسم سے۔۔۔ بڑی گالیاں بکتی تھی۔ ویسے میں نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ وہ عورتوں سے زیادہ مردوں کو اور مردوں سے زیادہ فطرت کو گالیاں بکتی تھی۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ فطرت یہ، فطرت وہ۔۔۔ بہت بکتی تھی۔ بہر حال میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میں نے اس بے چین طبیعت کو صرف ایک مرتبہ نشے میں دیکھا تھا۔۔۔ ہاں ہاں بے چین طبیعت۔

چلو! میں تمہیں پہلے اس کی بے چینی کے متعلق بتاتا ہوں۔ ویسے بھی میرے لیے اس کی شخصیت میں سب سے پرکشش چیز اس کی بے چینی تھی۔۔۔ ہاں نا۔۔۔ سوچ ہے تمھاری۔ تو سنو! کبھی اس نے کسی موضوع پر ایک دو منٹ سے زیادہ بات نہیں کی۔ ایک دم موضوع بدل لیتی تھی۔۔۔ او بہت نالج تھا۔ بڑی پڑھی لکھی تھی۔۔۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ ایسے موضوع بدلتی تھی۔ ایک دم تڑاخ سے، کبھی فیشن پر بول رہی ہوتی تو اچانک موسم پر بولنے لگتی۔ ایک دم موضوع بدلتی اور عورت پر بات کرنے لگتی۔ اسے وہیں ادھورا چھوڑ کر سیاست پر شروع ہو جاتی، حکومت پر تنقید کرتی۔ میں بھی ایک دو لقمے دے دیتا۔ وہ

فوراً ماں کی ایک موٹی سی گالی دے کر کہتی چلو۔ باہر چلتے ہیں۔۔۔ میں اس کے ساتھ بازار جانے میں سبکی محسوس کرتا تھا لہٰذا اسے ٹالتا تو یقین جانو وہ مجھے وہیں، اپنے کمرے میں چھوڑ کر آدھے پونے گھنٹے میں شہر کا چکر لگا کر واپس آجاتی۔۔۔ کبھی باتیں کرتے کرتے اچانک نہانے چلی جاتی اور کبھی انتہائی سنجیدہ باتیں کرتے ہوئے اٹھ کر ناچنے لگتی اور ایک دو اسٹیپ لے کر کسی ہیروئن کو گالی دیتی اور کہتی، ''گانے کے اس بول پر یہ اسٹیپ، حرامزادی! ناچ گانے کو بچوں کا کھیل سمجھتی ہے'' اور پھر وہیں کھڑے پوچھتی، ''ہاں تو وہ تمہاری نوکری کا کیا بنا؟''۔۔۔ وہ کچھ اس طرح کی پاگل سی لڑکی تھی۔۔۔ اور سن نا!۔۔۔ مزے کی بات ہے۔۔۔ ایک ہی ملاقات میں وہ کئی کئی مرتبہ میری کنگھی کرتی تھی اور کبھی کبھی تو میرا فل برائیڈل میک اپ کرنے بیٹھ جاتی تھی۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ میرا۔۔۔ او یار کھسرا تو لگتا تھا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ بس کر۔۔۔ سن نا!۔۔۔ اور وہ ادھورا سا کر کے چھوڑ دیتی تھی۔ میں نے کسی بات پر اسے کبھی ٹوکا نہیں تھا۔ جو اس کے جی میں آتا تھا وہ کرتی تھی۔۔۔ تمہیں سب سے حیران کن بات بتاؤں؟۔۔۔ تم ہنس ہنس کر پاگل ہو جاؤ گے اور کہو گے کہ یہ کمبخت آج کیسی باتیں کرنے لگا ہے؟۔۔۔ دیکھو! تم یقین نہیں کرو گے کہ بعض اوقات وہ بچوں کی طرح چھلانگ لگا کر میرے کندھوں پر چڑھ جاتی تھی۔۔۔ اور کبھی کبھی تو مجھے گھوڑا بنا کر مجھ پر سواری بھی کرتی تھی اور بچوں کی طرح ہنس ہاہاہا۔۔۔ ہنس کر پاگل ہو جاتی تھی۔۔۔ ہاں نا یار! بلا کی عورت تھی۔ راتیں بھی اس کی اسی طرح بے چین گزرتی تھیں۔ بہت زیادہ کروٹیں بدلتی تھی۔ کبھی اٹھ کر چھت پر ٹہلنے لگتی، کبھی ناچتی کبھی گاتی۔ ہاں یاد آیا، نہاتی بہت تھی۔ اکثر کہا کرتی تھی کہ پانی میں مجھے بہت سکون ملتا ہے۔ عجیب ہی لڑکی تھی یار پارہ بھرا ہوا تھا اس کے جسم میں۔۔۔ ہاں ٹھیک نشے کا؟۔۔۔ یار اس نشے والے دن بھی اس نے کہا تھا کہ غالباً وہ کوئی دو تین راتوں سے بالکل نہیں سو سکی تھی۔ بہر حال اس دن وہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کر کے شام کو بالکل تھک ہار چکی تھی۔ کافی دیر ہم دونوں بالکل خاموش لیٹے رہے تھے۔ اس نے ایک کروٹ بھی نہ لی۔ میں اسے

اس حالت میں دیکھ کر بہت حیران ہو رہا تھا۔ اس دن وہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر تالاب کی طرح پرسکون ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی بے چین حرکتوں سے محبت تھی یا شاید میں ان کا عادی ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی خاموشی سے ڈر لگنے لگا تھا۔ میں نے بوتل نکالی۔۔۔ تین چار، ہاں بالکل۔۔۔ تین یا چار پیگ پی کر وہ ایک دم بہک گئی۔ اس کی زبان میں باقاعدہ لکنت آ گئی تھی۔ ہونٹوں کے ننھے ننھے مسل اکڑ گئے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر گر پڑی۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن توتلی زبان میں مجھے گالی دے کر صرف یہ کہا، ''یہ۔۔۔ آج۔۔۔ تو نے۔۔۔ مجھے۔۔۔ کیا۔۔۔ پلا دیا ہے؟ مجھے۔۔۔ چکر۔۔۔'' اور وہ ڈھیر ہو گئی۔ آدھے پونے گھنٹے بعد جب اس کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو خود کو کوسنے لگی۔ خود کو گالیاں دے کر وہ اس بات پر حیران ہوتی رہی کہ اس نے مجھ سے دوستی کیوں کی؟ پھر مجھے گالیاں دینے لگی اور گالیوں گالیوں میں اس نے میرا قصور یہ بتایا کہ میں اس کی طاقت زائل کر رہا ہوں اور میں نے اسے بہت کمزور کر دیا ہے۔ اس دن وہ دیر تک عجیب عجیب باتیں کرتی رہی تھی۔ بہت عجیب یار! بالکل پاگلوں جیسی۔ شاید اس کا نشہ دیر تک نہیں اترا تھا۔ جگ گلاس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی، ''تمہیں پتا ہے کہ مرد نے اسے کیوں ایجاد کیا ہے؟ اس لیے کہ وہ اپنے اندر عورت کے قرب کی خواہش کو ہوا دے سکے۔ تمہیں پتا ہے اس نے گھر، بستیاں، شہر کیوں بنائے ہیں؟ تمہیں پتا ہے وہ کیوں لڑتا ہے؟ کیوں اتنی بڑی بڑی جنگیں کرتا ہے؟ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ آسائشیں حاصل کر کے پورے اطمینان کے ساتھ عورت کے سنگ وقت گزار سکے۔ ارے یہ حرامی جنگ چاہے تب بھی یہی خواہش، امن چاہے تب بھی، تمہیں نہیں پتا یہ خبیث اپنے لطف کو طویل تر کرنا چاہتا ہے۔ اسے جو بعد میں نقاہت ہوتی ہے نا! یہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ اپنے نامرد ہونے کا احساس ہوتا ہے اسے۔۔۔ اس حرامی کو۔۔۔ ارے یہ بھی کیا ہے۔ اس فطرت نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔'' وہ اس دن بہت دیر تک روتی رہی اور فطرت کو خوب گالیاں بکتی رہی۔۔۔ ہیلو! تم سن رہے ہو نا!۔۔۔ ہیلو!۔۔۔ ہیلو!!۔۔۔''

کسر

ان دونوں کے درمیان بلا کی خاموشی حائل تھی۔ ایسی خاموشی جس کے بارے میں سن کر یقین نہیں آتا تھا کہ میاں بیوی کے بیچ سناٹے کا ایسا رشتہ بھی ہوسکتا ہے۔ پنبہ دہنی کی ایسی مثال تو کہانیوں میں بھی نہیں ملتی۔ ایسی لمبی چپ جیسی دوستاروں کے بیچ ہوتی ہے۔ ان دونوں میں بھی شاید کئی نوری سال کا فاصلہ تھا اور درمیانی خلا سے آواز آر پار نہیں ہوسکتی تھی۔

ویسے بھی میاں بیوی کا رشتہ سمجھوتے اور بگار کی خوبصورت مثال ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میاں بیوی کے درمیان عشق نہیں ہوسکتا، ہوتا ہوگا مگر اکثریت اسے سمجھوتا اور بگار سمجھ کر نبھاتی ہے اور خوب نبھاتی ہے۔ میں نے تو ایسے گھر بھی دیکھے ہیں جہاں میاں بیوی میں باقاعدہ نفرت ہے۔ دونوں اس کا اظہار کھلے عام کرتے ہیں، لڑتے جھگڑتے ہیں، مار پیٹ ہوتی ہے لیکن بس چلتے رہتے ہیں۔ ریل کی پٹڑی کی طرح الگ الگ، ایک نپے تلے فاصلے پر رہتے ہوئے۔ لیکن اتنا سناٹا، اس قدر خاموشی، اتنی لمبی، چپ یقین نہیں آتا۔

جب پہلی مرتبہ عقیل نے الطاف اور نورین کے درمیان اس ہولناک خاموشی کا ذکر کیا تو یقین جانیے! میں نے ماننے سے صاف انکار کردیا تھا اور عقیل سے کہا تھا، ”یہ

ناممکن ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ میاں بیوی اور سارے دن میں ایک دو مکالمے؟ وہ بھی رٹے رٹائے اور پچھلے گیارہ سال سے؟ نا بابا نا یہ مبالغہ ہے۔'' لیکن عقیل کے بے حد اصرار پر اور الطاف کی حرکتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اور بعد کے واقعات کی روشنی میں مجھے طوعاً و کرہاً یہ ماننا پڑا کہ الطاف اور نورین کے درمیان واقعی ایک چپ کا کہرام برپا تھا۔

صبح کی اذان چارپائیوں میں چرچراہٹ بھرتی پھر جوتے گھسٹنے کی آواز سے دن کا آغاز ہو جاتا۔ الطاف ایک ہی وار میں نماز اور دکان کی تیاری کر کے چارپائی پر بیٹھ جاتا۔ نورین اس کے سامنے ناشتہ رکھ کر باقی کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ الطاف جیسے ہی ناشتہ ختم کرتا اس کے سامنے سے فوراً برتن اٹھا لیے جاتے اور جب وہ گھر سے باہر جانے لگتا تو نورین کسی کام میں مشغول کسی اور سمت دیکھتے ہوئے اس سے پوچھ لیتی، ''آج کیا پکانا ہے؟'' الطاف کا جو بھی جی چاہتا بتا کر باہر نکل جاتا۔

یہ ایک ایسا مکینیکل عمل تھا کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ الطاف تیار ہو کر چارپائی پر بیٹھا ہو اور ناشتے میں دیر ہوئی ہو یا الطاف ناشتہ کر چکا ہو اور برتن اس کے سامنے پڑے رہے ہوں یا الطاف گھر سے باہر نکلا ہو اور اس نے یہ جملہ نہ سنا ہو کہ آج کیا پکانا ہے یا الطاف نے ہی پہل کر دی ہو کہ آج فلاں چیز بنا دینا۔

اسی طرح الطاف ظہر کی نماز کے بعد گھر آتا، ہاتھ دھوتا (ہاتھ دھونا اس کی عادات میں شامل تھا) چارپائی پر بیٹھتا۔ فوراً اس کے سامنے کھانا اور آبخورے میں پانی رکھ دیا جاتا۔ نورین خود اِدھر اُدھر ہو جاتی۔ کھانا ختم ہوتے ہی برتن اٹھا لیتی۔ الطاف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ آرام کرتا اور پھر دکان پر چلا جاتا۔ رات کو کوئی دس ساڑھے دس بجے الطاف دکان سے گھر آتا۔ ہاتھ دھوتا (جو اس کی عادت تھی) اس کے سامنے کھانا آجاتا۔ اس وقت نورین بالکل فارغ ہوتی تھی کیونکہ آٹھ نو بجے تک بچے سو جاتے اور گھر کا کام بھی ختم ہو چکا ہوتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کمرے میں چلی جاتی اور الطاف کے کھانا ختم کرنے کا انتظار کرتی۔ ادھر کھانا ختم ہوتا، ادھر نورین نمودار ہوتی، برتن اٹھاتی۔ الطاف کے حکم کے

مطابق خوب رگڑ رگڑ کر برتن دھوتی اور اپنی چارپائی پر لیٹ جاتی۔ الطاف اٹھ کر صحن میں گن کر چالیس قدم چلتا اور پھر اپنی چارپائی پر دراز ہو جاتا۔ کمرے میں چارپائیوں کی ترتیب کچھ اس طرح تھی۔ پہلی چارپائی پر الطاف اور آخری نورین کی، درمیان میں تین چارپائیوں پر چھ عدد بچے۔

جب مجھے عقیل نے اس کے معمولات بتاتے ہوئے الگ الگ چارپائی والی بات سنائی تھی تو میں نے بے ساختہ پوچھا تھا، ''الگ الگ چارپائی پر اور یہ چھ بچے؟'' مجھے یاد ہے کہ عقیل میرے اس جملے پر اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں بند کیے دیر تک ہنستا رہا اور پھر شرماتے ہوئے بولا، ''جس دن الطاف کا جی چاہتا ہے اس رات ان کے درمیان ایک جملے کا اضافہ ہو جاتا ہے یعنی الطاف اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے کہتا، ''ذرا ادھر آؤ گی۔'' اور حیران کن بات یہ تھی کہ نورین کبھی انکار نہ کرتی۔ ہمیشہ بے حس و حرکت بت کی طرح اس کے پاس چلی جاتی۔'' عقیل نے بات مکمل کرتے ہوئے ہنس کر کہا تھا، ''تمہیں تو پتا ہے اس کا ہاتھ دھونا۔ ارے بھائی! کون گھی کے کنستر میں ہاتھ ڈالے؟''

یہ الطاف عجیب دکاندار تھا۔ ناقابل بیان حد تک صاف ستھرا۔ ستھراہٹ اس کی بیماری بن گئی تھی۔ میں نے تو اسے گڑ، چینی اور شکر تولنے کے بعد بھی ہاتھ دھوتے دیکھا تھا۔ مٹی یا سرسوں کا تیل بوتل میں ڈالتے وقت وہ عجیب الجھن میں رہتا اور گھی سے تو جیسے اس کی جان نکل جاتی تھی۔ اکثر اس کی خواہش ہوتی کہ لوگ گھی کا ڈبہ خرید لیں لیکن گاؤں کے دکانداروں کی یہ مجبوری ہوتی ہے کہ انہیں گھی کے کھلے کنستر رکھنے ہی پڑتے ہیں۔ سو وہ رکھتا تھا لیکن ادھر گاہک نے گھی مانگا ادھر الطاف پر متلی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ بہ امر مجبوری وہ گھی تول کر دے تو دیتا تھا مگر بعد میں کئی بار ہاتھ صابن سے دھوتا اور پھر تولیے سے صاف کر کر کے انہیں چھیل لیتا تھا۔

الطاف کے گاؤں میں کئی دوست تھے لیکن اس نے اپنے ازدواجی تعلقات کا ذکر صرف عقیل سے کیا تھا۔ عقیل ان معاملات میں کافی سمجھدار تھا۔ اس نے الطاف کو بار

بار سمجھایا۔ اُسے اس کی کمزوریاں بتائیں مگر الطاف اپنی کمزوریوں پر قابو نہ پاسکا۔ شروع میں کم از کم اسے اپنی کمزوریوں کا احساس تھا لیکن جب دو تین بچے ہو گئے تو الطاف مطمئن رہنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ نورین اس معمول کی عادی ہو کر اسی کے رنگ میں رنگی جا چکی ہے۔ بعد میں وہ عقیل سے فخریہ انداز میں کہا کرتا تھا کہ شوہر بیوی کی تربیت کرتا ہے۔ اب یہ شوہر کی مرضی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بازارو بنائے یا شریف عورت۔ سو وہ اپنی تربیت سے بہت خوش تھا۔ اس کے نزدیک نورین ایک مطمئن ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مسئلہ تو تب ہوتا ہے جب لڑائی جھگڑے ہوں، مار پٹائی ہو، گلے شکوے ہوں۔ وہاں تو خاموشی ہی خاموشی تھی لہذا وہ خاموشی کو مکمل رضا مندی جان کر خوش رہنے لگا تھا۔

ویسے بھی دو تین بچے پیدا کر لینے کے بعد شکی مرد کا اعتماد اپنی بیوی پر بڑھ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے ایسے مضبوط کھونٹوں سے عورت کو باندھ دیا ہے کہ اب کہیں بھاگ نہیں سکتی اور الطاف نے تو ایک دو چھوڑ، چھ کھونٹوں سے نورین کو کس دیا تھا۔

یہاں سے کہانی اچانک داستانوی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ الطاف کاروبار بڑھانے کے لیے دکان گاؤں سے شہر منتقل کرتا ہے۔ دونوں کا معمول یکسر بدل جاتا ہے۔ اب الطاف دکان کے جھمیلوں میں کہیں ہفتے بعد گھر لوٹتا ہے۔

ایسے میں ایک نوجوان، جس نے کوئی سال ڈیڑھ سال پہلے کلرکی شروع کی ہوتی ہے اور جو نورین سے کوئی چودہ پندرہ سال چھوٹا بھی ہوتا ہے، نورین کی زندگی میں در آتا ہے اور اس چھ بچوں کی ماں کو پتا نہیں کیا کچھ تصور کر لیتا ہے۔

اس نوجوان کی شکل بالکل بھی قابل قبول نہیں ہوتی۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی ہوتی ہیں۔ ناک، ہونٹ اور کان چہرے کی نسبت بڑے اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کا تعلق نوجوانوں کے اس گروہ سے ہوتا ہے۔

جنہیں ماں باپ کی محبت نہیں ملتی اور وہ خود کو بدصورت سمجھتے ہیں۔ اکثر تنہائی پسند ہوتے ہیں اور لوگوں سے بھاگتے پھرتے ہیں۔ کبھی کھل کر قہقہہ نہیں لگاتے بلکہ ہنستے ہوئے بھی ہونٹوں کو مروڑ کر ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر وقت ایک مصنوعی خول میں رہتے ہیں۔ ذرا آہٹ ہوئی تو کچھوے کی طرح سر ٹانگیں سب غائب۔ ان میں فیصلہ کرنے کی قوت نہیں ہوتی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دوسروں سے مشورے مانگتے پھرتے ہیں۔ ساری عمر انہیں کسی کے زیر سایہ رہنے کی عادت ہوتی ہے۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ ان سے بات تک نہیں کر سکتے۔ اسی لیے محبوبہ یا بیوی کی صورت میں ماں ڈھونڈھتے پھرتے ہیں تاکہ اس کے پروں تلے گھس کر زندگی گزار سکیں۔ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود، ایسے لوگ عاشق بہت اچھے ہوتے ہیں کیونکہ آؤٹ آف ڈیٹ عورت کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ اس کے سامنے ایسے بچھتے چلے جاتے ہیں کہ عورت شکل و صورت کو نظر انداز کر کے حکمرانی کے نشے میں گم ہو جاتی ہے۔

ایسا ہی ایک نوجوان نورین کے خلوت خانے میں گھس آتا ہے۔ نورین روکنے کی کوشش میں اسے کہتی بھی ہے کہ تمہیں اس طرح گھس آنے سے شرم نہیں آتی مگر پھر شرم کا کہتے کہتے وہ خاموش ہو جاتی ہے اور حالات کی طغیانیوں پر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر بہنے لگتی ہے۔

وہ نوجوان نورین کو چھوٹے چھوٹے تحفے دیتا ہے۔ پہروں بیٹھ کر اسے دیکھتا ہے، اسے سوچتا ہے، اس سے باتیں کرتا ہے۔ بہت سی باتیں، بے شمار، ٹنوں کے حساب سے اور سب کی سب نورین کے بارے میں۔ باتیں نورین کے خاموش صحرا میں ابر باراں ثابت ہوتی ہیں۔ وہ بنجر عورت لہلہانے لگتی ہے۔

وہ نوجوان بدصورت ہوتا ہے۔ اس کی شکل و صورت کا مقابلہ الطاف سے نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے گڑ، شکر اور گھی کے کھلے کنستر سے گھن نہیں آتی۔ اس کے ہونٹ اور ہاتھ بڑے سخی داتا ہوتے ہیں۔ نورین حیران رہ جاتی ہے کہ وہ ایک عمر تک اپنے اندر

موجود رنگا رنگی سے کس قدر ناواقف رہی اور کیسے اب اس کے مردہ بدن سے یہ ٹھاٹھیں مارتا لاوا اُبل پڑا ہے۔

اس نوجوان کی آمد سے پہلے نورین کی زندگی کا واحد مقصد ان بچوں کی پرورش ہوتا ہے جو الطاف کے بے رونق عمل کا نتیجہ ہیں۔ شاید یہ وجہ ہوتی ہے یا گھر کا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ نورین بچوں سے والہانہ لگاؤ نہیں رکھتی جو عام طور پر روایتی ماؤں میں ہوا کرتا ہے لیکن اب اس نوجوان کے آجانے سے نورین میں تبدیلی یہ واقع ہوتی ہے کہ وہ اپنے بارے میں سوچنے لگتی ہے۔ نوجوان کے کہنے پر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کی آواز میں ترنم ہے۔ نوجوان کے کہنے پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہنستی بہت اچھا ہے۔ اس کی آنکھوں کے اشارے، اس کے ابروؤں کی حرکت، اس کے ہونٹوں کی جنبش، اس پر جچنے والے کپڑوں کے رنگ، رفتہ رفتہ اس کی آئینے سے دوستی ہوجاتی ہے۔ وہ آئینے کے آگے رکتے رکتے گنگنانے لگتی ہے۔

جب نوجوان سے اس کی ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا ہے تو آسمان منور ہونے لگتا ہے۔ اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ ستارے چمکتے ہی نہیں جھلملاتے بھی ہیں۔ چاند صرف روشن نہیں ہوتا بلکہ سرگوشیاں بھی کرتا ہے۔ بادل صرف برستے ہی نہیں ان کے رنگ بھی ہوتے ہیں، وہ صورتیں بھی بدلتے ہیں۔ بارشیں صرف زمین پر اثر انداز نہیں ہوتیں بلکہ انسان کے اندر بھی ہلچل پیدا کرتی ہیں۔ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا انسان کے اندر کی تازگی اور اداسی سے کتنا گہرا تعلق رکھتا ہے۔

نورین کے اندر خوف اور الجھنوں کے جالے، جو پہلے اسے آسمان نہیں دیکھنے دیتے تھے، اچانک زمین پر آگرتے ہیں۔ جس طرح پہلے اسے آسمان دُھندلا دکھائی دیتا تھا اب زمین دھندلانے لگتی ہے۔

کچھ عرصہ ایک دوسرے میں گم رہ کر آسمان تکتے رہنے سے ان دونوں کے پر نکل آتے ہیں۔ وہ دونوں زمین سے اٹھنا شروع ہوجاتے ہیں۔ زمین، کیچڑ میں تبدیل

ہونے لگتی ہے۔ پھر کیچڑ سبز بدبودار کائی میں بدل جاتا ہے۔ سارے لوگ اور الطاف اور بچے مٹی میں کیڑوں کی طرح چھوٹے چھوٹے راستوں سے کہیں سوراخوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں اوپر اور اوپر اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ آسمان اجلا ہو کر خوب نیلا ہو جاتا ہے اور زمین گیند بن کر رہ جاتی ہے۔

وہ دونوں تو نئے جہان کی طرف اڑتے اڑتے غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن الطاف اپنی الجھنوں میں گھی کے کنستر سے گھناتا اپنے ہاتھ دھونے ہی لگتا ہے کہ لوگوں کی لیس دار چپ چپی زبانیں اس کے بدن سے سانپوں کی طرح لپٹ جاتی ہیں اور اس کی متلی قے میں بدل جاتی ہے۔

حرامزادے

(ایک باریک بین اور دُور اندیش سیاست دان کی سرگزشت)

حرامزادوں نے غلیظ جسموں پر بدبو دار، پسینے سے اکڑے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ فروٹ منڈی میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے میں نے محسُوس کیا کہ ان کم بختوں کے کپڑوں کا رنگ بہت عجیب تھا۔ میرے خیال کے مطابق پورے پاکستان میں اس رنگ کے کپڑے نہ تو کہیں بنتے ہیں اور نہ بکتے ہیں۔ پتا نہیں یہ کس دیس کے لوگ تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ ان لوگوں میں سے اکثر کی آنکھوں کے اطراف سفید ریشے جمے ہوئے تھے۔ گالوں پر پھپین کا لیپ منہ دھونے کے باوجود باقی تھا اور دانتوں کی درزیں ہلکے پیلے مواد سے اٹی ہوئی تھیں جن پر تقریباً اسی رنگ کا لیس دار مادہ ہونٹوں کی حرکت سے ہلتا تو متلی ہونے لگتی تھی۔ جب یہ بات کرتے تو منہ سے بو کے بھبکے اڑتے اور ہاتھ اٹھاتے تو بغلوں سے۔ عجیب غلیظ اور ملیچھ لوگ تھے۔ اکثر جو بڑی بڑی داڑھیوں والے تھے انھیں دیکھ کر میرے ہاتھوں کو الجھن ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دنیا کی ساری بے ترتیبی ان کی داڑھیوں میں سمٹ آئی ہو۔ ان داڑھی والوں میں سے جب کوئی ٹرک سے پیٹی اتارتے ہوئے اوپر دیکھتا تو اس کی گندی گردن کسی پہاڑی دنبے کی ران معلوم ہوتی تھی۔ ان کے

بازوؤں اور ہاتھوں کا ہر مسام سیاہی سے اٹا ہوا تھا۔ خاص طور پر ان کے ناخن بہت ہی برے تھے۔ چپٹے سفید اور اطراف میں غلاظت کا سیاہ حاشیہ۔۔۔ جنھیں دیکھنے سے کیا بتانے سے مجھے کراہت ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں یہ حرامزادے کیسے ان بدبودار کریہہ ہاتھوں کو منہ تک لے جاتے ہوں گے؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک مزدور نے میرے دیکھتے ہی دیکھتے نسوار ڈال لی۔ میں نے اس حرامی کو بہن کی ایک موٹی سی گالی دے کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔۔۔ یہ واقعی نجس ہیں۔ انھیں اچھوت ہونا چاہیے۔

وہاں گھومتے گھومتے میں ان لوگوں میں ایسا محو ہو گیا کہ انہی کے متعلق سوچنے لگا۔ مجھے اچانک ان کونوں کھدروں کا خیال آیا جہاں یہ لوگ رہتے ہیں۔ مجھے ایک بار وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں انہی کی طرح ان کے پیلی رنگت والے بچے ہڈیوں کا پنجر بنے سارا سارا دن ٹوٹی پھوٹی گٹر نما گلیوں میں کھیلتے ہیں اور ان کی عورتیں الامان و الحفیظ! بو، میل اور لٹکتے گوشت کا ملغوبہ ہیں۔ ان کا جسم کندھوں سے سرین تک تقریباً بغیر خم کھائے بہت بھدا معلوم ہوتا ہے اور سامنے سے پیٹ اور پستان میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ میرے دور اندیش ذہن نے گندگی کی کیا کیا تصاویر آنکھوں کے سامنے گھما دیں۔ ان کی بغلوں اور پستانوں کے نیچے کا حصّہ، پیٹ کے بل اور رانوں کے درمیان میل کی تہیں اور بدبو کے حوض بھرے پڑے تھے۔۔۔ یہ خیال آتے ہی میری باریک بینی نے، پوری فلم چلا دی۔۔۔ میل سے مسام میں کالے دھبے بنے پھر ان سے باریک سُرمئی لہریں دوسرے مسام تک چلی گئیں پھر یہ لہریں دبیز ہو کر تہوں میں بدل گئیں۔۔۔ پھر گرمیوں کا منظر گھوما۔۔۔ اور یہ حصے گرمی دانوں کے بگڑنے سے کیسے پلپلے ہو کر بساند دینے لگے۔۔۔ ان عورتوں کو دیکھ کر پہلے تو مجھے خیال آیا تھا کہ ان کے مرد آخر ان کے پاس جاتے کیسے ہوں گے؟ دیکھو! کچھ ہونٹوں کا قرب ہوتا ہے۔ کچھ جسم کی مہک ہوتی ہے۔ کچھ ہاتھوں کی جنبش اور کچھ جسموں کا لمس، لیکن یہ کیا بکواس ہوئی کہ ناک کو سڑاند ملے۔ ہونٹوں کو نمکین بد ذائقگی، ہاتھوں کو کھردرا پن اور جسموں کو چپچپاہٹیں۔۔۔ لیکن پھر خیال آیا کہ وہ حرامزادے

بھی تو اتنے ہی غلیظ ہیں۔ ان میں لطافت کہاں؟؟ اسی لیے تو ان کی گلیوں میں بچے ساون کیڑوں کی طرح چلبل چلبل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

فروٹ منڈی میں گھومتے گھومتے یقین جانو! ان مزدوروں، غریب پھل فروشوں اور ریڑھی والوں کو دیکھ دیکھ کر میں دنیا کے حسن کو کیا، پھلوں، ان کی خوشبوؤں اور ذائقے تک کو بھول چکا تھا۔ میرے سامنے انسانیت سراپا غلاظت بنی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ میں نے دور کھڑے ایک ٹرک کو دیکھا جس کے گرد لوگ خریداری میں مشغول تھے۔ ان میں سے ایک غلیظ پر میری آنکھیں جم گئیں۔ میں اس کے جسم اور کپڑوں کی غلاظت کو ناک چڑھا کر دیکھ رہا تھا۔۔۔ کہ اچانک۔۔۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔۔۔ وہ شخص فضا میں بلند ہوتا چلا گیا۔ اس کے اعضا جسم سے الگ ہونے لگے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے۔ پہلے میل اور کالک کی تہہ ٹوٹی۔ پھر جلد پھٹی۔ پھر گوشت کے ریشے ربڑ کے باریک تانتے بن بن کر الگ ہونے لگے۔ جب رگیں چر کر چٹختیں تو خون کے فوارے پھوٹتے تھے۔ پھر ہڈی میں بال سے باریک لہر پیدا ہوتی۔۔۔ پھر گہری دراڑ بنتی۔۔۔ پھر گودا اُچھلتا۔۔۔ پھر ہڈی کی دوسری طرف گوشت مہین مہین تانتے بنا کر چرتا چلا جاتا اور پھر جلد اندر کی جانب سے دو حصوں میں تقسیم ہوتی تو ایک حصہ کٹ جاتا مگر دوسرا دور تک گوشت ننگا کرتا ہوا کہیں دور سے میل کی تہہ توڑ کر چیتھڑا بن جاتا تھا۔ یہ عمل ہوا میں اڑتے شخص کے نجانے کتنے حصوں میں بیک وقت ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں، لمحے کے شاید کروڑویں حصے میں، درد کی شدّت۔۔۔ موت کا خوف۔۔۔ اور بچ جانے کی امید دیکھی تھی مگر۔۔۔ مگر وہ شخص میرے دیکھتے ہی دیکھتے تقسیم در تقسیم ہوتا چلا گیا۔ وہ کسی آتش انار کی طرح فضا میں رنگ بکھیر کر پل بھر میں۔۔۔ ارد گرد کے درختوں پر۔۔۔ بجلی کے تاروں اور کھمبوں پر۔۔۔ عمارتوں کی چھتوں اور دیواروں پر بکھر گیا۔۔۔ معلوم نہیں، اب کتنی بارشیں اور کتنی ہوائیں اس کا جسم مٹّی میں شامل کریں گی۔

میں اس ہولناک منظر سے سکتے میں چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ میرے حواس قابو

میں آتے۔۔۔وہ کمبخت۔۔۔حرامزادے، ننگے غلیظ، بھوک سے بلبلاتے بچے اچانک سارے منظر پر چھا گئے۔وہ گٹر نما نالیوں میں خوراک کے لیے تیز تیز ہاتھ مار رہے تھے اور جب کبھی سڑکتی ناک کو ہتھیلیوں سے صاف کرتے تو میل کی دبیز تہہ ان کے چہرے پر جم جاتی تھی۔ جس سے مہین مہین کیڑے نمودار ہو کر اژدھے بن رہے تھے۔ یکا یک ان بچوں کے پس منظر سے غلیظ عورتیں پیش منظر میں نمودار ہوئیں۔ان کے پیٹ کے غلیظ بل، پستانوں کے نیچے کا حصہ اور رانوں کے بیچ کی جلد اور اکڑے ہوئے بھورے بالوں والی بغلوں کے تعفّن اور پلپلی جلد نے مجھے چکرا دیا اور میں گر پڑا۔

تصویریں

مجھے تو اُس کی پیدائش کا دن بھی یاد ہے۔ جب وہ سرخ گوشت کا ایسا لوتھڑا تھی۔ جسے دیکھ کر گھن آتی ہے۔ اُس کا چہرہ تب جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ جھریوں بھرے چہرے پر بُر نما بال تھے۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ جنھیں وہ زور زور سے بند کر کے روتی تھی لیکن جب بھی وہ آنکھیں کھولتی تو جیسے نئے نکور بلور باہر آجاتے تھے۔ اُس کے ہونٹوں پر پیپڑی جمی تھی۔ اوپر کے ہونٹ کا درمیانہ حصہ اُبھرا ہوا بہت بھدا لگ رہا تھا۔ سر کی چوٹی پر بال گھنے اور تقریباً سیدھے کھڑے تھے۔ باقی سر پر رُوئیں کی طرح تھے۔ یہی رُواں اُبھرے ہوئے ماتھے سے بھوؤں تک آگیا تھا۔۔۔ یعنی سر کے بالوں اور بھوؤں کے حاشیے بالکل غیر واضح تھے۔ اُس نے پتلی پتلی تنکوں جیسی انگلیوں سے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں۔ اُس کا جسم پلپلا سا تھا۔ میں نے مصنوعی پیار جتانے کو اُس کے گال چھوئے تھے تو پھوڑے جیسی نرماہٹ سے جیسے میری جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ ایسی نرماہٹ تھی جس کے چھونے سے مجھے اُبکائی آجاتی ہے۔

اُس نے میری آنکھوں کے سامنے اِس کچے پن سے بچپنے کا سفر طے کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ شوخ اور شرارتی لڑکی بن گئی تھی۔ گال بھر گئے تھے۔ جلد میں ایسی انوکھی ملائمت پیدا ہوگئی تھی کہ اسے چمکارنے کو جی چاہتا تھا۔ چہرے سے بُر جھڑ

گئی تھی۔ بال اور بھویں ابھی پوری طرح واضح نہ ہوئی تھیں۔ ہاتھ پاؤں، بچپنے کی نرمی سے ذرا موٹے موٹے اور پھولے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اُس کی آنکھیں ابھی تک نئے بلّور کی طرح تھیں، یعنی سیاہ حصہ چمکدار سیاہ اور سفید چمکتا ہوا سفید۔ ہونٹ بے رنگ، کانوں کی لویں زرد لیکن گردن گد گدی سے بھری ہوئی۔ جلد میں بچپنے کا کچا پن بہت نمایاں تھا۔ سر کے بال بالکل سیدھے ملائم اور چمکدار ہو کر سر کے چاروں طرف بکھر گئے تھے۔

بچپن میں اُس کا بھاگنا، دوڑنا، اٹکھیلیاں کرنا، لڑنا جھگڑنا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنس ہنس کر بے حال ہونا۔ مجھے اِس طرح یاد ہے جیسے وہ سب کچھ ابھی میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔

وہ بہت لاڈلی تھی۔ جب کبھی وہ ناراض ہو کر چیختی چلاتی تو اسے بڑے لاڈ پیار سے منایا جاتا تھا۔ میں نے بچپن میں جس طرح کی سختیاں دیکھی تھیں اور جو ڈانٹ ڈپٹ میرے حصے میں آئی تھی۔ وہ اس سے بالکل ناآشنا تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی شخصیت میں وہ کھلا پن، باتوں میں روانی، آنکھوں میں تیزی اور ہنسنے میں بے ساختہ پن اور فیاضی تھی۔ جو مجھے ایک عمر کی ریاضت کے بعد بھی حاصل نہ ہو سکی۔

میں نے جب بھی خود کو اس کے مقابلے میں رکھا۔ میری نظریں میرے پاؤں سے اوپر نہ اُٹھ سکیں۔ میں ویسے بھی احساسِ کمتری کا شکار تھا لیکن اُس کے سامنے تو جیسے میں مر ہی جاتا تھا۔ اِس سب کے باوجود میرا ذہن آج تک اُس کے معاملے میں اَجنتا کے غاروں سے کم نہیں ہے۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُس پر جوبن آیا۔ دھیرے دھیرے، جیسے صبح ہوتی ہے۔ جیسے کچی کونپلیں، ہولے سے، تازہ ملائم پتیوں میں بدل جاتی ہیں۔ میں نے اُس کی ننھی شرارتوں کو الھڑ پن میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ میرے سامنے اُس کی معصوم چہلیں، اداؤں میں بدل گئیں۔ میری آنکھوں نے گالوں کی سرخی کو، مسحور کر دینے والی

گلابی رنگت میں بدلتے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور میں نے نظروں کو تیر بننے کا مشاہدہ کیا۔۔۔ جب اس کے بالوں اور بھوؤں کے حاشیے واضح ہوئے تو پیشانی پر بانکپن جگمگ جگمگ کرنے لگا۔ بالوں میں سنہرا پن آیا تو شعاعوں جیسی چمک اور حدّت پیدا ہو گئی۔۔۔ میرے دیکھتے دیکھتے اُس کے ہونٹ رَس سے بھر گئے۔ اُس کے کانوں میں عجیب قسم کا کرنٹ دوڑنے لگا۔ ہاتھوں، بازوؤں اور پاؤں کی جلد میں ایسی تازگی آئی کہ انھیں چھونے کو جی چاہتا تھا۔ اُس کے سینے میں خم آیا اور کندھے کشادہ ہو گئے۔ اچانک اُن کھمبیوں کے اُگ آنے سے۔۔۔ لڑکیوں میں، خوف اور خوشی کی مِلی جُلی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے وہ کیفیت اُس کے دوپٹہ سنبھالنے کی ادا میں محسوس کی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے اُس کی رگوں میں چلتا خون سرمست ہو کر آنکھوں اور گالوں اور ہتھیلیوں پر موجزن رہنے لگا تھا۔ جلد جسم پر تن کر ملائم ہو گئی تھی۔ اُس کا میانہ قد اپنی تمام تر رعنائیوں پر آ گیا تھا۔۔۔ پتا نہیں کب اور کیسے؟ وہ کائنات کے مرکزی نقطے پر ایستادہ ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ دھیرے دھیرے ہوا۔ مگر اس قدر اچانک جیسے پلک جھپکتے میں ہو گیا ہو۔ بالکل جیسے پہاڑی علاقوں میں نیلے آسمان پر بادل کسی چوٹی کے پیچھے سے سر اٹھاتا ہے۔ دھیرے دھیرے مگر پلک جھپکتے میں اندھیرا بن کر چھا جاتا ہے۔ یہ سب بھی اسی طرح ہوا۔۔۔ آہستہ آہستہ۔۔۔ مگر بہت ہی تیز۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب اُس کی بے نیازی اپنے عروج پر تھی۔ میں احساسِ کمتری کا مارا پتا نہیں کیوں اس سے خوفزدہ رہنے لگا تھا۔ میں نے جلد ہی اپنے اس خوف کو عشق کا نام دے دیا مگر میرے اس خوف کے مارے عشق کا انداز انتہائی احمقانہ تھا۔ میں اسے آتا دیکھ کر راستہ بدل لیتا تھا۔ بات کرنے کا موقع مل جائے تو نیچے دیکھ کر فوراً بات ختم کر کے بھاگنے کی کرتا کیونکہ مجھے اپنی آواز اُس کے سامنے کرخت اور بھدی لگتی تھی۔ اُن دنوں میری خواہش ہوتی تھی کہ وہ چند دنوں کے وقفے سے میرے پاس سے گزر جایا کرے اور بس!!۔۔۔ ان دنوں میں ہر وقت اُس کو سوچتا رہتا تھا۔ خیالوں میں اُس سے لاکھوں

باتیں کیا کرتا تھا۔ اِس طرزِ عمل نے میرے لیے ایک الگ دنیا قائم کر دی تھی۔ حقیقت کی تلخ دنیا سے دور۔۔۔ بہت دور۔۔۔ اپنی دنیا، جہاں سب میری مرضی سے ہوتا تھا۔۔۔ آج تک میں اسی دنیا میں عافیت محسوس کرتا ہوں۔

۔۔۔ پھر ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی۔۔۔ اچانک کچھ ایسے مواقع میسر آئے کہ وہ میرے قریب ہوتی چلی گئی۔۔۔ جس سے بات کرنا تو کجا دیکھنے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔۔۔ وہ سمٹ کر میری بانہوں میں آ گئی تھی۔۔۔ میں ساکن ہو گیا تھا۔۔۔ کائنات میرا طواف کرنے لگی تھی۔

وہ میرے اتنے قریب آئی کہ ''وہ'' ختم ہو گئی۔ صرف ''میں'' رہ گیا۔ یقین جانیے! اُس دور کی میرے ذہن میں اُس کی کوئی تصویر محفوظ نہیں ہے۔ ان چند سالوں کی سلیٹوں کو میں نے بارہا چھان پھٹک کر دیکھا لیکن وہاں صرف میری اپنی تصویریں تھیں۔

۔۔۔ پھر ڈھول شہنائیاں بجیں۔۔۔ میں اکیلا رہ گیا۔۔۔ اُس کا نیا گھر بہت دور تھا۔۔۔ اتنا دور۔۔۔ وہاں کے تو چاند تارے بھی ہماری زمین کے نہیں تھے۔ میں پتھر کی سِل بن گیا۔ وقت کی ٹِک ٹِک، ہتھوڑوں کی طرح مجھ میں دراڑیں ڈالتی گئی۔ میں ذرہ ذرہ بکھرتا گیا۔ اِس کرب سے میں ایسا بے سُدھ ہو گیا۔ جیسے حد سے سوا درد انسان کو بے ہوش کر دیتا ہے۔

میں خود سے بے خبر، زندگی کے جھمیلوں میں اُلجھ کر کہیں بہت دور نکل گیا تھا۔ میں کئی سالوں کے انبار تلے بے سدھ پڑا تھا کہ اچانک میرے قریب پڑے فون پر جیسے ہاتھ اُگ آئے۔۔۔ اُن ہاتھوں نے میرا ریزہ ریزہ چن کر مجھے مکمّل کر دیا۔۔۔ یہ وہ تھی۔۔۔

ایک بار پھر اُس کی تصویریں میرے ذہن پر نقش ہو رہی تھیں۔۔۔ وہ اُدھیڑ عمر عورت۔۔۔ جس کے ماتھے پر بانکپن کی جگہ متانت نے لے لی تھی۔۔۔ جس کا جسم تھوڑا پھیل جانے سے اُس کا قد قدرے پست دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے کندھے ذرا جھک گئے تھے۔ جس کے چہرے پر ناک پہلے کی نسبت کچھ بڑی دکھائی دیتی تھی۔ جس کے

گالوں کے مسام کھل کر، مسحور کر دینے والی گلابی رنگت، جذب کرنے لگے تھے۔۔۔نظر کُند ہو رہی تھی۔۔۔آنکھوں کی سیاہی اور سفیدی آپس میں گھلنا شروع ہو گئی تھی۔۔۔کانوں کی لویں بے جان تو نہیں ہوئی تھیں پر اَدھ موئی ضرور ہو گئی تھیں۔۔۔ہاتھوں اور بازوؤں پر چھوٹی چھوٹی سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ چہرے پر جھریاں ابھی نہیں پڑی تھیں لیکن اُن کے آثار، آنکھوں کے اطراف سلوٹوں سے۔۔۔اور ماتھے کی شکنوں سے۔۔۔اور ناک سے ہونٹوں تک جانے والی لکیروں سے نمایاں ہو رہے تھے۔ گردن بَل دار ہو رہی تھی۔ یہ ملاقاتیں بہت مختصر مدت کی تھیں لیکن ہم دونوں کو زندہ کر گئی تھیں۔ یہ احساس کہ ہم جدا ہو کر بھی کبھی الگ نہیں رہے تھے اِس قدر تسکین کا باعث تھا کہ نا قابلِ بیان ہے۔

پھر ایک طویل تاریکی چھا گئی۔۔۔لمبی جدائی۔۔۔یہ جدائی اگرچہ زہر تھی۔۔۔تلخ تھی۔۔۔مگر گوارا تھی۔ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل تھا لیکن دل سے بہت ہی قریب۔۔۔کوئی رابطہ نہیں تھا۔۔۔مگر ہر وقت کا رابطہ تھا۔۔۔یہ عجیب محبّت تھی۔

اس کے بعد ہمیشہ میری نظریں قریبی فون پر جمی رہتی تھیں۔ مجھے لگتا تھا کہ فون کی گھنٹی بجے گی اور اِس پر ہاتھ اُگ آئیں گے۔۔۔مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔۔۔اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔۔۔وقت گزرتا گیا۔۔۔ایک عرصہ بیت گیا۔

کل قدرت نے ایک انوکھا کھیل کھیلا۔۔۔میں علاج کی غرض سے ہسپتال گیا ہوا تھا۔ وہاں مجھے اچانک اُس کا چھوٹا بھائی مِل گیا۔ اُس کے چہرے کی ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔۔۔کچھ دیر بعد۔۔۔میری سفید پلکیں جھپک کر ذہن کی خستہ دیواروں پر۔۔۔بے جان تصویریں نقش کر رہی تھیں۔۔۔چہرے پر، شاید ناک ایک ایسی علامت تھی۔ جس سے وہ پہچانی جا رہی تھی۔۔۔باقی چہرہ۔۔۔چہرہ تو تھا ہی نہیں۔۔۔ہونٹ سُکڑ کر باریک کاغذ کے ہو گئے تھے۔۔۔ٹھوڑی اوپر کو اُٹھ آئی تھی۔۔۔ناک کے دائیں بائیں دو گڑھے تھے اور گلابی گال انہی میں کہیں دھنس گئے تھے۔ آنکھوں سے اُوپر ہڈی سلوٹوں بھرے ماتھے سے بہت باہر نکل آئی تھی۔ چہرہ جھریوں سے اَٹا ہوا تھا۔۔۔جھریوں کی کھائیوں

میں رنگ سیاہی مائل تھا جبکہ اُوپر کے حصے میں مسام گڑھے بن گئے تھے۔میں کافی دیر، رک کر سوچتا رہا۔۔۔اس کا ڈھانچہ اِس قدر بدوضع تو نہ تھا۔۔۔آج اِس کا چہرہ کیسا دکھائی دے رہا تھا؟

میں نے غیرارادی طور پر اُس کا چہرہ چھونے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔۔۔ابھی ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مجھے اُس کی پیدائش کا دن یاد آگیا۔جب میں نے مصنوعی پیار جتانے کو اُس کے گال چھوئے تھے تو پھوڑے جیسی نرماہٹ سے میری جان ہی نکل گئی تھی۔وہ ایسی نرماہٹ تھی جس کے چھونے سے۔۔۔مجھے اُبکائی آجاتی ہے۔

آئی ایم سوری ژندی جان!

(اپنے اکلوتے بیٹے ژند ماجد کو پریشان دیکھ کر)

"ژندی جان!۔۔۔آئی ایم سوری یار!۔۔۔میں کہانی بھول گیا تھا۔جب یاد آئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔۔۔خیر تم اس بات کو چھوڑ و اور کہانی سنو!۔۔۔زرد کلغی والے مرغ کی کہانی۔

ایک پنجرے میں کئی مرغ اور مرغیاں رہتے تھے۔پنجرہ بہت بڑا تھا۔اتنا بڑا کہ اس کی سلاخیں نظر نہ آتی تھیں۔سلاخیں نظر نہ آنے کی وجہ سے کسی کو قید کا احساس نہ ہوتا تھا۔

احساس ہوتا بھی کیسے؟ وہاں تو پہاڑی سلسلے بھی تھے۔جن پر جا بجا جھرنے پھوٹتے تھے۔سبز گھاس کے قطعے بھی تھے۔شفاف جھیلیں بھی تھیں۔انواع واقسام کے پودے اور درخت بھی تھے۔دانا دُنکا، کیڑے مکوڑے، تتلیاں پتنگے بھی وافر تھے۔مرغیاں اپنی سُریلی آواز میں کڑکتی پھرتی تھیں۔مرغے پر پھڑ پھڑا کر، سینہ تان کر بانگیں دیتے تھے۔زندگی پھولوں کی خوشبوؤں اور رنگوں میں لپٹی ہوئی گزر رہی تھی۔

ایک جھیل کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں کچھ خودرَو جھاڑیاں تھیں۔ان میں سے ایک جھاڑی میں ایک مرغی نے انڈے دے رکھے تھے۔جب اسے انڈے سیتے

اکیس (۲۱) دن گزر گئے، تو ریشم کی سی ملائم بُر والے چوزے نکل آئے۔ جھاڑی تازہ زندگیوں سے جھولنے لگی۔ چُوں چُوں کی آواز سے مرغی مسرور ہونے لگی۔ ننھّے ننھّے چوزوں کی حرکت سے مرغی کے پروں تلے اور سینے اور ٹانگوں پر گدگدی ہونے لگی۔ یہی اُس کی محنت کی داد تھی۔۔۔یہی اُس کی خوشی تھی۔

چوزوں کو کھلانے کے لیے جب وہ انڈوں کے خالی خول توڑ کر ٹُٹ ٹُٹ کرتی تو وہ دوڑ کر باہر نکل آتے۔ مرغی اُنھیں دیکھ کر سرشار ہوتی اور اُن کی حفاظت میں اور مستعد ہو جاتی تھی۔

مرغی کے اُن پیارے پیارے بچوں میں وہ چوزہ بھی تھا جو بعد میں زرد کلغی والا مرغ بنا۔ خیر اُن دنوں تو جب وہ ماں کے مضبوط پروں سے نکل کر انگڑائی لیتا تو زندگی اس کے ساتھ جھوم جاتی تھی۔ وہ جب اِدھر اُدھر چھلانگیں لگاتا تو کائنات اُس کے سنگ بچہ بن کر اچھلتی اور اٹکھیلیاں کرتی تھی۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہ بہت خوش تھا۔ مزے ہی مزے تھے۔ ماں کا سائبان جو موجود تھا، نہ کوئی خوف نہ خطرہ نہ خوراک کی فکر، کھیل ہی کھیل، ہر بات کھیل۔ اِدھر ماں نے پتنگا پکڑا اور ٹُٹ ٹُٹ کی اُدھر دوڑیں لگ گئیں۔ کوئی ایک پہلے بھاگتا ہوا ماں کی چونچ سے شکار لے اڑا، باقی سب اُس کے پیچھے پیچھے، کسی نے آدھا چھینا، کوئی، بھوکا رہا، کوئی کھا گیا، کوئی منہ تکتا رہ گیا لیکن اس چھینا جھپٹی میں بڑا مزہ آتا تھا۔ موجیں ہی موجیں تھیں۔ خوشیاں پہاڑ کی چوٹی پر جمی برف کی طرح چمکتی تھیں۔ پہاڑ کی تہہ میں لاوے سے سب بے خبر تھے۔

ایک دن مرغی کو بُھر بُھری مٹی نظر آئی اور وہ اُس میں کُھر بُل کرنے لگی، چوزوں کو یہ کام بہت پسند آیا۔ پہلے پنجوں سے مٹی نرم کرنا، اُسے پروں میں بھرنا اور پھر اُس میں لوٹ پوٹ ہونا، واہ واہ!!۔۔۔ایسا مزہ تو انھیں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ مستی تو پتنگے کی چھینا جھپٹی سے بھی زیادہ پر لطف تھی۔ ابھی یہ چوزے ماں کی دیکھا دیکھی کُھر بُل کر ہی رہے تھے کہ ایک پتنگا قریب سے گزرا، باقیوں کو تو پتا بھی نہ چلا مگر ایک دو چوزے اس کے پیچھے

بھاگ پڑے اور ماں سے کچھ دور چلے گئے۔ وہ ہوا میں اُچھل اُچھل کر اُسے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شکار چونچ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود شکار ہو گئے۔

قریب ہی کوئی بلی شکار کی منتظر تھی۔ اُس نے جو چوزے دیکھے تو ان پر جھپٹ پڑی اور ایک چوزے کو پکڑ لیا۔ چوزے نے بہت شور مچایا اور خود کو بچانے کی بہت کوشش کی۔ اُدھر مرغی نے جو چوزے کی آواز سنی تو غصے اور خوف سے چلائی۔ بلی کی طرف پر پھیلا کر بھاگ پڑی۔ سب چوزے جہاں تھے سہم کر زمین سے چپک گئے۔ مرغی نے بہت کوشش کی مگر بلی چوزے کو اپنے نوکیلے دانتوں میں دبا کر بھاگ گئی۔ مرغی پریشانی سے پَر پھیلائے باقی بچوں کی طرف لوٹ آئی۔ انھیں پروں تلے سمیٹ لیا۔۔۔ کچھ دیر تک خوف ناک آوازیں نکالتی رہی، جس سے سب بہت ہی زیادہ خوفزدہ رہے۔

وقت نے کچھ ہی دیر میں فراموشی کے پردے سرکا دیے۔ پھر وہی اُچھل کود، دھوم دھڑ کے شروع ہو گئے۔ لیکن وہ خاص چوزہ، جو بعد میں زرد کلغی والا مرغ بنا تھا، باقیوں کی نسبت زیادہ دیر تک اُس معصوم چوزے کی دہشت ناک آواز اپنے کانوں کے پردوں پر رینگتی ہوئی محسوس کرتا رہا جسے بلی نے شکار کیا تھا۔ شاید وہ سب سے زیادہ ڈر گیا تھا یا شاید زندہ رہنے کی ہوس اُس میں باقیوں کی نسبت زیادہ تھی۔

کچھ دن جب اور گزرے تو اُن چوزوں کا تعارف اپنے قبیلے سے ہوا۔ اب یہ تمام چوزے ماں کے علاوہ اپنے قبیلے کے باقی مرغے مرغیوں سے بھی زندگی کے گُر سیکھنے لگے تھے۔ ان کے پَر اور دُم نکل آئی تھی۔ جسم سے بُر تیزی سے جھڑ رہی تھی۔ مرغ یا مرغی ہونے کی شناخت جسم پر سجنے لگی تھی۔ گلابی کلغیاں نکل آئی تھیں۔ زندگی کے اس دور میں، اچانک ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ تبدیلی یہ تھی کہ اُن کے کھیل لڑائیوں میں بدل گئے۔

پہلے تو یہ صرف ننھے ننھے پر پھیلا کر انگڑائی لیتے، پھر اِدھر اُدھر بھاگ کر، مذاق میں ایک دوسرے سے لڑنے کے انداز بناتے، گردن کے پر اکڑا لیتے لیکن دوسروں کو گزند یا تکلیف پہنچائے بغیر چگنے میں مصروف ہو جایا کرتے تھے۔

اب ہوا یوں کہ مذاق ہی مذاق میں کسی ایک کو چوٹ لگ گئی۔ اس نے غصے میں دوسرے کی جلد اُدھیڑ دی اور لڑائی شروع۔ یہ لڑائی اچانک تمام چوزوں میں پھیل گئی۔ کسی عالمی جنگ کی طرح۔۔۔ بڑی سنجیدگی سے۔۔۔ کیونکہ یہ جنگ، اقتدار کی جنگ تھی۔ اس سے آئندہ کے فیصلے ہونے تھے کہ کون سب سے زیادہ طاقتور ہے؟ کس کا خوراک پر زیادہ حق ہے؟ کون قبیلے میں سینہ تان کر اذان دے گا؟ کون مرغیوں سے آزادانہ مل سکے گا؟ تمام آسائشوں پر کس کا پہلا حق ہوگا؟

اُس چوزے کی کلغی ابھی اپنے ہم عمروں کی طرح گلابی ہی تھی۔ اُس نے بھی ان جنگوں میں حصہ لیا۔ بقا کی جنگ میں وہ زخمی بھی ہوا۔ کئی سرکشوں کو اس نے زیر بھی کیا اور بعضوں سے اُسے شکست بھی ہوئی۔ جب ہار جیت کا یہ قصہ ختم ہوا اور آئندہ کی زندگی کے اہم فیصلے ہو چکے تو اس رات وہ تھکن سے چور ہو کر ماں کے پروں تلے دبک کر پچھلے دنوں کے واقعات پر سوچ رہا تھا کہ اُسے پنجرے کی سلاخیں کہیں دور افق پر دکھائی دیں۔ گھٹن کا ہلکا سا غبار اُس نے دل پر محسوس کیا۔

اگلی صبح وہ اُن چوزوں کو مارنے کے لیے بھاگتا جن پر اس نے فتح پائی تھی اور جن سے اس نے شکست کھائی اُن سے دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ سب کچھ طے ہو گیا۔ اس طرح مارنے یا مار کھانے کی نوبت نہ آتی تھی۔ جب طاقتور آتا تو کمزور خود ہی الگ ہو جاتا تھا۔ کیونکہ خوراک اور آسائشوں پر پہلا حق طاقتور کا تھا۔

طاقتور کمزور کو مارتا تھا۔ مگر یہ ماں اچانک طاقتور کیسے ہو گئی تھی؟ ماں کے رویے میں تلخی دیکھ کر وہ چوزہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ جب سے اُس کے نئے پر نکلے تھے اور اس نے کُڑک کُڑک کے ساتھ کرانکنا بھی شروع کر دیا تھا اُن دنوں سے وہ کچھ لاپرواسی ہو گئی تھی لیکن اب تو اس نے باقاعدہ مار کر الگ کر دیا تھا۔ مہربان ماں بے رحم ہو گئی تھی۔

پہلی رات جو اُس نے کھلے آسمان تلے گزاری۔ وہ اُس کے دل کی بے رونقی بڑھا گئی تھی۔ اُس دن اُسے سب کچھ بہت فضول سا لگا۔ بے آسرا پن نے اُسے دبوچ

لیا۔ سلاخیں اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتی رہیں۔ گھٹن کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کی سرخ ہوتی کلغی گلابی ہی رہ گئی تھی۔

آہستہ آہستہ وہ کھلے آسمان کا عادی ہو گیا۔ زندگی اُسے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ مرغیوں کے پَروں کی چمک، ان کے کرانکنے کی آواز اُسے بھلی لگنے لگی۔

وہ دن اُس کے لیے بہت بڑی خوشی کا دن تھا جب اُس نے پہلی ادھوری اذان دی تھی۔ اپنے مکمّل مرغ ہونے کا احساس اسے بہت اچھا لگا۔ کیونکہ یہ احساس لذیذ خوراک دوسروں سے چھیننے، کھربل کرنے اور جنگ جیتنے سے بھی کہیں زیادہ خوشگوار تھا۔ اس دن اذان دینے کے بعد وہ ایسے اِترا اِترا کر چلتا رہا کہ اُس کا پورا پنجہ زمین پر نہ لگتا تھا۔ وہ بے کراں فضاؤں میں اُڑتا رہا۔

پہلے دن تو اُس کی خوش قسمتی تھی کہ کوئی اور مرغ وہاں موجود نہ تھا۔ لیکن اگلی صبح جب اس نے اذان دی تو کئی طاقتور مرغ اُس کے اِردگرد موجود تھے جنھیں اُس کا مکمّل ہونا ایک آنکھ نہ بھایا۔ انھوں نے عجیب حرکت کی۔ اِدھر اُس نے اذان شروع کی اُدھر وہ اُس پر جھپٹ پڑے۔ اُس بے چارے کو بھاگ کر اذان مکمّل کرنا پڑی اسے یہ زباں بندی بہت بری لگی۔ خوشی کا احساس غارت ہو گیا۔ مکمّل ہونا ادھورا رہ گیا۔ مرغیوں کے سامنے یہ ذلت۔۔۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ وہ اتنے مرغوں سے لڑ تو نہیں سکتا تھا۔۔۔ اس کا غرور خاک میں مل گیا۔

اس کے باوجود اُس کے دل میں مرغیوں کی کشش تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اُس کی کلغی اپنے ہم عمروں کے مقابلے میں کم سرخ تھی لیکن زندگی بڑھانے والے جرثومے اُس میں ہلچل پیدا کر رہے تھے۔ اب یہ پورا مرغ تھا۔ بانگ دینے والا۔ مرغیوں کی کشش نے اسے کھانا پینا بھلا دیا تھا۔ نسل بڑھانے کی قوت لذت کے سنگ ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ جب بھی یہ مرغیوں کی قربت حاصل کرنا چاہتا تھا طاقتور اسے دور دھکیل دیتے تھے۔ اسے ابھی تک کسی مرغی کا قرب میسر نہیں آیا تھا لیکن اپنے پنجوں تلے اُن کے

چمکتے پروں کی سرسراہٹ اور چونچ اور زبان پر اُن کے سر کے بالوں اور کلغی کا ذائقہ اسے دیوانہ کیے رکھتا تھا۔ وہ اُن کی طرف بھاگتا مگر کوئی نہ کوئی مصیبت حائل ہو جاتی۔ زندگی مقابلہ تھی ۔۔۔۔ مگر کیوں؟؟ یہ اسے نہیں پتا تھا۔

ایک دن وہ مرغیوں کو اپنے مکمل ہونے کی نوید سنانے کے لیے پَر پھڑ پھڑا ہی رہا تھا کہ قبیلے کا بوڑھا سردار جھاڑیوں کے پیچھے سے بھاگتا ہوا نکلا۔ زرد کلغی والا مرغ حملے کے ڈر سے پیچھے ہٹ گیا لیکن کیا دیکھتا ہے کہ بوڑھے سردار کے پیچھے ایک جوان سرکش مرغ بھاگتا آرہا ہے۔ وہ اُن دونوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ جب وہ اُس کے قریب سے گزر کر جھیل کے کنارے پہنچے تو جوان مرغ آہستہ ہو کر رک گیا۔ بوڑھا سردار پھر اس کی طرف مڑا۔ کافی دیر تک لڑائی جاری رہی۔ دونوں لڑ لڑ کر ہلکان ہو چکے تھے۔ ان کے منہ، چونچیں اور کلغیاں لہو (خون) میں لت پت ہو رہی تھیں۔ زبانیں لٹکی ہوئی تھیں۔ بالآخر جوان مرغ نے بوڑھے سردار کی گردن میں چونچ پیوست کی اور دونوں ٹانگیں جوڑ کر اس کے سینے پر ماریں اور قصہ تمام ہوا۔ نئے سردار کا دور شروع ہو گیا۔

یہ دیکھ کر نوجوان مرغ کے دل میں دنیا کی بے ثباتی رچ بس گئی۔ رات کو درخت پر بیٹھ کر وہ سوچتا رہا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ بوڑھے سردار نے کیا حاصل کر لیا؟ نیا سردار کیا حاصل کر لے گا؟ لایعنی اور بے معنی پن نے پنجرے کی سلاخوں کو اُس کے اور قریب کر دیا۔ اُس نے شدید گھٹن محسوس کی اور اُس کی کلغی زردی مائل ہو گئی ۔۔۔۔ ابھی وہ اسی غم میں مبتلا تھا کہ وبا پھوٹ پڑی، کئی مرغے اور مرغیاں سر نہوڑائے کھڑے رہتے۔ کچھ کھاتے نہ پیتے پھر بیٹھ جاتے، چونچ زمین پر ٹیک دیتے اور مر جاتے تھے۔ اس بیماری نے قبیلے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بیماری جب قبیلے سے رینگ کر گزری تو بہت ہی کم مرغیاں اور مرغے زندہ بچے تھے۔ اس نوجوان مرغے نے شدید تنہائی محسوس کی سلاخیں اُس کی آنکھوں سے جڑ گئیں۔ گھٹن نے دل کو جکڑ لیا۔

جہاں کئی کمزور مرے تھے۔ وہاں بہت سے طاقتور بھی گل سڑ کر ختم ہو چکے

تھے۔ بظاہر اسے خاصی آزادی حاصل ہوگئی تھی۔ اُس سے طاقتور ایک دو مرغ ہی زندہ بچے تھے۔ وہ بھی اکثر دانہ دنکا چگتے دور نکل جاتے تھے۔ اب یہ زیادہ آزادی سے مرغیوں کے ساتھ گھوم سکتا تھا۔ زیادہ آزادی سے خوراک حاصل کر سکتا تھا۔ زیادہ آزادی سے بانگ دے سکتا تھا۔۔۔ لیکن وبا نے اسے آزاد کہاں چھوڑا تھا۔ یہ آزادی تو باقیوں کے لیے تھی۔ جنھیں برف سے چمکتی چوٹیوں کی تہہ میں دکھ کے سرخ لاوے کا احساس نہیں تھا۔ اسے تو پنجرے کی سلاخیں دل پر محسوس ہونے لگی تھیں۔ اُس کی کلغی پوری طرح زرد ہوگئی تھی۔۔۔ بلکہ کلغی کی زردی اُس کی سوچوں میں اتر گئی تھی۔ وہ زندگی کی طویل زنجیر کی کڑیوں کا تسلسل تھا۔ اسے اپنا دائرہ پورا کرنا تھا۔ ایک سیدھے سریے کو جسم کی حدّت سے گزار کے زنجیر میں اس طرح کڑی بنا کر پرونا تھا کہ اگلی نسل اس سے اپنی کڑی جوڑ سکے۔۔۔ لیکن اُس سے دائرہ مکمّل نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اُن ننّھے چوزوں سے شدید محبت تھی جو اُس کے اندر اُبل رہے تھے۔ جنھیں اپنا آپ سونپ کر اسے فنا کی حسین وادیوں میں گم ہو جانا تھا۔۔ مگر اُس کی سوچوں میں کلغی کی زردی شامل ہوگئی تھی۔ اُسے سب کچھ زرد دکھائی دینے لگا تھا۔۔۔ سلاخوں میں جکڑا ہوا۔۔۔ گھٹن میں لپٹا ہوا۔

ان سلاخوں اور گھٹن کے باوجود زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ مرغیوں کے پروں میں جگمگاتی تو اُس کے پیروں تلے گدگدی ہونے لگتی۔ اُس کی چونچ، مرغیوں کی کلغی اور رنگین بالوں کے ذائقے سے بھر جاتی تھی۔ کائنات رقص کرنے لگتی۔ اُس کے اندر غم اور خوشی۔۔ موت اور زندگی کی چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی۔۔۔ بالکل اسی طرح جیسے بچپن میں ماں کی چونچ میں پتنگا دیکھ کر یہ سب چوزے اُس پر جھپٹتے اور آدھا حصہ ایک لے جاتا تھا اور آدھا دوسرا۔ بالکل اسی طرح غم اور خوشی بلکہ رجائیت اور قنوطیت اسے آدھا آدھا کر دیتی تھیں اور یہ پتنگے کی طرح تڑپتا رہ جاتا تھا۔۔۔ برف سے چمکتی چوٹی اور تہہ میں موجود لاوا آپس میں گڈمڈ ہو جاتے تھے۔

اِس کشمکش میں وہ تھک ہار گیا۔۔۔ کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف۔۔۔ بالآخر

اُس نے زندہ رہنے کے لیے ایک نیا اور انوکھا راستہ ڈھونڈھ نکالا۔۔۔وہ مرغیوں کے پاس جاتا ضرور تھا مگر ایسے کہ زنجیر کی کڑی مکمّل نہ ہونے پائے تاکہ اُس کے اندر اُبلتے ننّھے چوزے پنجرے کی قید تک نہ آنے پائیں۔۔۔مرغی کی پِیٹھ پر اُس کی دُم کبھی نہیں جھکتی تھی۔۔۔زندگی بڑھانے والے جرثومے رزقِ خاک ہو جاتے تھے۔وہ اِس نئی راہ ملنے پر بہت خوش تھا۔عرصہ گزر گیا۔وہ بہت مطمئن تھا۔۔۔ایک دن پتا نہیں کیا ہوا۔۔۔وارفتگی میں اُس کی دُم جھک گئی۔۔۔وہ چلایا۔۔۔''اوہو!! یہ کیا ہو گیا مجھ سے؟''۔۔۔غلطی ہو گئی اُس سے۔۔۔اب افسوس کے سوا کیا ہو سکتا تھا؟؟

یہ تھی زرد کلغی والے مرغ کی کہانی۔۔۔آئی ایم سوری۔۔۔ژندی جان!''

جلا کر راکھ کر دینے والی ٹھنڈک

۔۔۔تو بتا میں یہ رہا تھا کہ فن کار کو مواد اکٹھا کرنے کے لیے کن کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی ہلاک کر دینے والی بلند چوٹیوں تک پہنچتا ہے جہاں آکسیجن کی کمی پھیپھڑوں کو پتھر بنا دیتی ہے۔ گلیشیر کی ٹھنڈک میں نظریں تک جم جاتی ہیں، کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ کبھی تاریک گھاٹیوں میں اترتا ہے جہاں خار دار جھاڑیوں سے پوشاک تار تار ہو جاتی ہے۔ بدن کا ستر آشکار ہو جاتا ہے۔ عموماً سچ کی راہ فریب کی وادی سے ہو کر گزرتی ہے۔ اب اسے ہرجائی کہو یا دغا باز، پر حقیقت میں یہی وہ فنکار ہے جس کے فن سے ہڈیوں کے گودے کی مہک آتی ہے۔

بوڑھا فنکار سر جھکائے بیٹھا ہے۔ اس کے دو ادھیڑ عمر بیٹے بھی سر نہوڑائے غصے اور شرم سے کانپ رہے ہیں۔ ایک گوری چٹی لڑکی، حسن کی معراج، عمر سولہ سترہ سال، کرسی پر شرمندگی اور غصے کی چادر اوڑھے زمین کو گھور رہی ہے۔

اِس لڑکی کی ماں کمرے کے بیچ میں کھڑی چلا رہی ہے، ”اِس بڈھے خرانٹ کو میری ہی بیٹی ملی تھی اِن خرافات کے لیے؟ توبہ توبہ!! میسج تو دیکھو اس حرامی ٹھرکی کے۔۔۔ سنگ سار کر دینے کے قابل ہے یہ کمینہ!۔۔۔یہ۔۔۔“

ایک کاغذ فنکار کے بیٹے کی طرف بڑھاتے ہوئے۔

''یہ۔۔۔یہ۔۔۔ میسج کی رپورٹ نکلوائی ہے۔۔۔دیکھو اس کی کارستانیاں۔ خدا کی پناہ! اِسے تو موت بھی یاد نہیں ہے۔''

۔۔۔ بیٹا باپ کو غصے اور شرمندگی کے ملے جلے تاثرات سے گھورتا ہے اور صفحہ دوسرے بھائی کی طرف بڑھا دیتا ہے۔۔۔ ماں، بیٹوں سے مخاطب ہو کر۔۔۔

''تمہیں وہ میسج بھی پڑھاتی ہوں۔ کہیں جسم کی حدت۔۔۔ کہیں کپڑوں کا اُتارنا۔۔۔ توبہ توبہ!!۔۔۔ برباد کر دی میری بچی اِس ذلیل نے۔ اِس لسٹ میں وقت اور تاریخ دیکھنا، کئی کئی راتیں نہیں سوئے یہ دونوں۔ اِس مردود کی عمر کے لوگوں کو رات کے اندھیرے میں قبر کی تاریکی نظر آتی ہے۔ اسے دیکھو!۔۔۔ اُف اللہ!! مجھے ہی اُٹھا لیا ہوتا۔ اے پروردگار! ایسے کمینوں کو اتنی ڈھیل کیوں دیتا ہے؟؟۔۔۔ آگ لگے اِن موبائلوں کو۔۔۔ مار دیں ختم کر دیں ساری قدریں اِس نے۔۔۔ اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا۔۔۔ لڑکے لڑکیاں تو تباہ ہو ہی رہے تھے۔ اب یہ چٹ داڑھیے بھی اس بے غیرتی میں پڑ گئے۔ توبہ! ہمارے وقتوں میں میاں بیوی آپس میں اتنے بے باک جملے نہیں بولتے تھے۔۔۔ اللہ! میں کدھر جاؤں؟ میری بچی تباہ ہو گئی۔ (بچی کی طرف مڑ کر) ''یہ بھی تو کنجری ہے۔ اسے بھی پردادے کی عمر کا عاشق مل گیا تھا۔ موبائل پر سہی لیکن کتنے دن یہ دونوں میاں بیوی کی طرح رہے''۔۔۔ موبائل سیٹ نکال کر میسج نکالتے ہوئے۔۔۔ ''پچھلے ہفتے تم لوگ مری گئے تھے نا؟ وہاں تین دن رہے۔ یہ بڈھا تمہارے ساتھ تھا۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ دیکھو میسج۔۔۔ ایک ایک منظر ایک ایک واقعہ لکھ کر بھیجا ہے۔ اِسے۔۔۔ اِسے یہ باور کروایا ہے جیسے دونوں ہنی مون پر گئے ہوئے تھے۔۔۔ اِس میں۔۔۔ اِس میں۔۔۔ تصویریں دیکھو اس بڈھے کی۔۔۔ شرم نہیں آتی اِس کو۔۔۔ میں نے اپنی بیٹی کی تو ڈیلیٹ کر دیں۔ پر اسے ننگا کر کے چھوڑوں گی۔۔۔ میری بچی کی تصویریں نیٹ پر آجاتیں تو میں ساری دنیا کو آگ لگا دیتی۔''

بیٹا۔۔۔ عورت کو چپ کرواتے ہوئے۔۔۔ ''کیا آپ ہی بولتی رہیں گی؟۔۔۔

مجھے تو یقین ہی نہیں آتا۔۔۔ میرا باپ ایسی غلیظ زبان استعمال کرسکتا ہے"۔۔۔ماں بات کاٹتے ہوئے، میسج دکھا کر۔۔۔ "غلیظ زبان؟ ذرا دیکھو یہ میسج۔۔۔غلیظ نے زبان کہاں کہاں استعمال کی ہے۔۔۔ میں اس کو ننگا کر کے رہوں گی۔۔۔اپنی بیٹی کی وجہ سے چپ ہوں۔۔۔ورنہ اس سور کتے کو نوچ کھاتی۔"۔۔۔فنکار کے بیٹے نے اسے چپ کروایا ۔۔۔ "آپ کے دکھ کو سمجھتا ہوں میں۔۔۔ میں خود بیٹیوں والا ہوں۔ آج اس شخص کی وجہ سے میرا سر شرم سے جھک گیا ہے۔(باپ سے مخاطب ہو کر) بولیے! کیوں کیا یہ سب آپ نے؟ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میں کیا کہوں؟ آپ نے ہمیں کیا کیا نصیحتیں نہیں کیں ۔۔۔اب یہ سب۔۔۔ اِس معصوم کی عمر دیکھیے۔۔۔ میری رمنا سے بھی چھوٹی ہے۔۔۔ایسا کون سا لاوہ پک رہا تھا آپ کے اندر۔۔۔اس کمسن پر اتنا ظلم؟"۔۔۔سب بوڑھے فنکار کو گھورتے رہے۔ وہ ذلت کی سرخی سجائے خاموش رہا۔ جواب تو بہت تھے لیکن وہ سمجھا نہیں سکتا تھا۔۔۔لڑکی کی ماں کا منہ تھا کہ آتش فشاں کا دہانہ بنا ہوا تھا۔۔۔ "یہ منحوس کیا بولے گا؟ زندگی تو میری بیٹی کی برباد ہوئی ہے۔۔۔ یہ نمبر اِسے (بیٹی کی طرف اشارہ کر کے) اِس کے منگیتر نے دیا تھا۔۔۔اسے شک ہوا تو اس نے یہ ریکارڈ نکلوایا ہے۔۔۔ منگنی توڑ گیا۔۔۔ خاندان میں منہ دکھانے جوگا نہیں چھوڑا اِس حرامی کنجر بڈھے نے۔ وہ کہہ کر گیا ہے جہاں اِس کنجری کی شادی ہوئی۔۔۔ وہیں جا کر اس کی بدکاری کا پلندا دکھائے گا۔ اب کنواری مرے گی میری بیٹی۔۔۔ میں کیا کروں؟۔۔۔یہ دلّا تو مر جائے گا چند دنوں میں۔۔۔ یہ پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزارے گی؟ ابھی اس کے باپ کو نہیں پتا۔۔۔وہ تو زندہ جلا دے گا اس کو (بیٹی کو مارتے ہوئے) خبیث کیا کر دیا تو نے۔"۔۔۔

دوسرا بیٹا جو کافی دیر سے چپ تھا۔ کہنے لگا، "میں کل ہی اپنے بچوں کو لے کر جا رہا ہوں۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچوں کو اس خبر کی بھنک بھی پڑے۔"

دوسرے بھائی نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے کہا، "شکر ہے میں تو پہلے ہی الگ ہو گیا تھا۔ میرے بچے تو ان سے محفوظ ہیں۔ آئندہ میں کبھی نہیں آؤں گا۔ آپ تنہا

رہیں۔۔۔ جئیں یا مریں۔۔۔ ہم اب بھی۔۔۔''

عورت بات کاٹ کر پاگلوں کی طرح بولی، ''واہ جی واہ! میری بیٹی اس کی ہوس میں جل کر راکھ ہو گئی؛ میرا خاندان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا؛ بچی برباد ہو گئی؛ تمہارے گھر خبر نہ جائے؟ یہ اچھا انصاف ہے۔۔۔ میری ایک بات کان کھول کر سن لو! میں نے چیخ چیخ کر دنیا ہلا دینی ہے۔ تمہارے خاندان کو برباد کر دینا ہے۔ تمہاری آئندہ نسلیں منہ چھپاتی پھریں گی۔ میں اخبار یں بھر دوں گی۔ چینلز اس ٹھرکی بڈھے کے پیچھے ہوں گے۔''

۔۔۔ بیٹا پھر سمجھاتے ہوئے بولا، ''آپ سمجھنے کی کوشش کریں اس طرح کی باتوں سے ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ یہ تو آج مرے کل دوسرا دن۔ اس معصوم کے لیے مسئلہ ہو گا۔ بدنامی تو اس بے چاری کی ہو گی۔ اب آپ صبر ہی کریں۔''

۔۔۔ وہ پھر چلانے لگی۔۔۔ ''میں پریشان نہ ہوں؟؟ ریکارڈ ہے اُس لڑکے کے پاس۔۔۔ وہ بلیک میل کرے گا اس کو''۔۔۔

بیٹا: (یقین دلاتے ہوئے) میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ یہ میری بچیوں کی طرح ہے۔ میں آپ کو اُس لڑکے سے سارا ریکارڈ نکلوا کر دوں گا۔

ماں: جھوٹی تسلّیاں نہ دو مجھے۔ اب مجھے کچھ سچ نہیں لگ رہا۔۔۔

بیٹا: باپ کا گند ہے۔ صاف تو مجھے کرنا پڑے گا۔ آپ بھروسا رکھیں۔

ماں: (روتے ہوئے) اس کا باپ آئے گا تو کیا جواب دوں گی اُسے کہ کیا تربیت کی میں نے اس کی؟

بیٹا: دیکھیں بہن! حوصلہ رکھیں۔ ان لوگوں نے میسج ہی تو کیے ہیں۔ خدانخواستہ کوئی اور اُونچ نیچ تو نہیں ہوئی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔

ماں: اُونچ نیچ کا کیا پتا؟ تمھیں یہ پتا ہے کہ اس خنزیر کو کیا کیا جتن آتے ہیں؟ پتا نہیں کیا نشہ کر دیا، کیا جادو کر ڈالا ہے۔۔۔ میرا جی کرتا ہے۔۔۔ تم نے۔۔۔ تم نے میسج

نہیں پڑھے نا!۔۔۔ میبج پر ڈانس کرتا رہا اس کے ساتھ۔۔۔ مساج کرتا ہے۔۔۔
سر دباتا ہے۔۔۔ توبہ توبہ!! پاگل کر رکھا ہے بچی کو۔۔۔ میں کیا کروں؟ کس کو
سمجھاؤں؟

بیٹا: (باپ کی طرف دیکھتے ہوئے) آپ کچھ تو کہیے۔۔۔ پر اس کے بعد آپ کہہ بھی
کیا سکتے ہیں؟؟

۔۔۔ لڑکی تنگ آکر بول اٹھتی ہے، ''بس کریں بہت ہوگئی۔ مسلسل ان کی بے
عزتی کیے جا رہے ہیں۔ آپ کیوں نہیں کہتے کے ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے
ہیں۔ مجھے عمر کی کوئی پروا نہیں تو آپ۔۔۔''

ماں شیرنی کی طرح جھپٹ پڑی اور بالوں سے پکڑ کر مارتے ہوئے بولی:

''بکواس بند کر کتیا!''

۔۔۔ فنکار کے بیٹے نے مشکل سے بیچ بچاؤ کیا۔۔۔ لڑکی چیختی رہی۔

''مار لو جتنا مارنا ہے ہم محبت کرتے ہیں۔ ہم شادی کریں گے۔۔۔ نہیں رہ
سکتے نہیں رہیں گے ایک دوسرے کے بغیر''۔۔۔ ماں بھی چلاتی رہی۔

''مردود لاشوں سے شادی نہیں ہو سکتی۔ یہ ادھ موا ڈھانچہ صرف میبج کر سکتا ہے
بس!''۔۔۔ بیٹی کی زبان بھی کھل گئی تھی۔

''مما! انف از انف!! آئی ڈونٹ کیئر۔ میں ٹھیک کہتی ہوں۔ میں نہیں چھو
ڑوں گی انھیں اکیلا''۔۔۔ (بیٹوں سے مخاطب ہو کر)۔۔۔

''آپ لوگ جائیں، دور ہو جائیں، لے جائیں اپنی فیملیز کو اور مما! آپ کا
بھانجا دکھاتا پھرے دنیا کو ہمارے میبجز، بٹ میں ان کے ساتھ ہوں۔ نہیں رہنا میں نے
ان کے بغیر''

ماں: بک مت کنجر کی اولاد، زبان کھینچ لوں گی میں تیری۔۔۔

بیٹا: (چلاتے ہوئے) یہ کیا بکواس ہے؟ سب چیخ رہے ہیں۔ ایک تماشا بنا ہوا ہے چپ

کرو سب !۔۔۔ (سب خاموش ہو جاتے ہیں)۔۔۔ ہر کوئی شور کر رہا ہے اور یہ مجرم مزے سے تماشا دیکھ رہا ہے۔ کچھ تو بولیں نا ! آپ بھی کریں گے اس سے شادی؟ بے ہودہ میسج بھیج بھیج کر یہ جو عشق کا ڈھونگ رچایا ہے۔ کوئی جواب ہے آپ کے پاس؟۔۔۔ (باپ کے کندھے جھنجھوڑ کر) بولیں نا!۔۔۔

لڑکی جھپٹ کر بیٹے کو دور کرتی ہے۔ ''پاس بیٹھ کر کوئی نہیں چھوئے گا انھیں۔ یہ میری جان ہیں۔۔۔ (فنکار کے منہ پر ہاتھ پھیر کر) بہت اِنسلٹ ہو چکی۔''

ماں: (چیختے ہوئے) مت چھوا سے! مرے گی میرے ہاتھوں۔۔۔

بیٹے کا حوصلہ جواب دینے لگا، ''آپ کچھ بکیں گے یا میں آج بدتمیزی کر بیٹھوں گا''۔۔۔ ماں بھی چلائی، ''بک نا بڈھے! حرامزادے! یہ کیا کیا ہے تو نے؟؟''

بیٹا: آپ آج مریں گے میرے ہاتھوں۔۔۔

لڑکی: پلیز جانو! پلیز ان سے کہہ دیں۔ ہمیں اکٹھے رہنا ہے۔ آپ مجھ سے عشق کرتے ہیں۔ بتادیں کہ ہم محبّت کرتے ہیں۔۔۔

بوڑھا فنکار یہ جانتے ہوئے کہ وہ جاہل اس کی بات نہیں سمجھیں گے۔ بولنے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔

لڑکی: پلیز! کہیں آپ مجھ سے۔۔۔

بوڑھا فنکار: مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔

لڑکی: (حیرت سے) کیا؟ کیا کہا آپ نے؟

بیٹوں اور لڑکی کی ماں کے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

بوڑھا فنکار: ہاں! میں نے تو صرف ایک کہانی لکھنا تھی۔ میں صرف ایک تجربے سے گزرا ہوں۔۔۔ اور بس۔

لڑکی: تو نے۔۔۔ تو نے۔۔۔

اس بے چاری کے لفظ کہیں گم ہو گئے تھے۔۔۔ بوڑھے فنکار نے سب کی طرف

دیکھ کر بڑے اعتماد سے کہا، ''میں نے بس ایک کہانی لکھنا تھی اور بس۔'' لڑکی غصے میں آگ بگولہ ہو کر فنکار کے منہ پر تھوکتی ہے اور باہر چلی جاتی ہے۔۔۔سب کے جانے سے کمرا خالی ہو جاتا ہے۔اکیلے پن پر فنکار کا ایک آنسو گال تک بہہ آتا ہے۔۔۔۔ فنکار کی سانولی رنگت اور تھوک پر، موتی کا قطرہ یوں چمک رہا ہے جیسے فن کے آسمان پر اس کی کہانی۔۔۔

صابن

ایک لڑکی نے دوسری لڑکی سے پوچھا، ''لڑکے جب آپس میں اکیلے بیٹھتے ہیں تو کیا باتیں کرتے ہیں؟'' دوسری نے کہا، ''وہی باتیں جو تنہائی میں لڑکیاں آپس میں کرتی ہیں۔'' اس پر پہلی لڑکی بولی، ''چھی چھی چھی! کتنے بے شرم ہوتے ہیں یہ لڑکے۔''

اسے یاد آیا کہ دانش کے اس لطیفے پر وہ کتنی دیر تک ہنستی رہی تھی۔ اس زمانے میں تو ویسے بھی ان دونوں پر اکثر ہنسی کے دورے پڑا کرتے تھے۔ جب وہ دونوں مل بیٹھتے تو لامتناہی باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کی نازک ٹہنیوں سے دیو قامت قہقہے پھوٹنے لگتے تھے۔ وہ سب باتیں ان کی آپس کی باتیں ہوتی تھیں۔ بالکل ذاتی۔ دنیا کی کوئی بات، کوئی بڑے سے بڑا حادثہ ان دونوں کے درمیان کبھی موضوع نہ بنتا۔۔۔ اس زمانے کا وقت۔۔۔ ہمیشہ روشنی کی رفتار سے تیز ہو کر اپنے گزرنے کا احساس کھو بیٹھتا تھا۔

لیکن اب وقت کچھوا چال چلنے لگا تھا۔ بالکل بور، تھکا دینے والی کیونکہ اب ان دونوں میں کوئی ذاتی بات، کوئی آپس کی بات نہ ہوتی تھی بس روٹین کی باتیں ہوتی تھیں۔ بچوں کے بارے میں، مہنگائی کے بارے میں، کسی شادی کے بارے میں وغیرہ

۔۔۔بالکل روٹین کی باتیں۔۔۔بالکل روٹین کی زندگی۔۔۔اکتا دینے والی۔۔۔ڈپریشن طاری کر دینے والی۔

آج اسے اپنے جسم سے صابن کی بُو آ رہی تھی۔اس نے کئی مرتبہ پرفیوم لگایا مگر اس کے ہاتھوں سے اس کے جسم کے ایک ایک انگ سے صابن کی بُو آ رہی تھی۔اس نے اپنے پورے جسم پر خوشبو دار پاؤڈر اچھی طرح سے ملا، ہزار طرح کی کریمیں لگائیں مگر صابن کی بُو کے بھبکے تھے کہ آتے چلے جا رہے تھے۔

وہ ایک مرتبہ پھر ماضی میں چلی گئی۔اس نے سوچا کہ شادی سے پہلے وہ اور دانش کیسے آپس میں گھل مل گئے تھے۔بالکل دوستوں کی طرح وہ آپس میں ہر بات کر سکتے تھے۔ ہر وہ بات جو لڑکیاں یا لڑکے، جب آپس میں اکیلے بیٹھتے ہیں، تو کرتے ہیں۔۔۔چھی چھی چھی۔۔۔ایک مرتبہ اسے دانش بتا رہا تھا، ''ہماری زندگی میں صابن کی بہت اہمیت ہے۔صابن ہمیں غلاظت سے پاک کرتا ہے۔'' اس انکشاف پر وہ کیسے شرما کر ہنسی تھی اور دانش کو قریب پڑی کتاب مار کر کہا تھا، ''کتنی گندی باتیں کرتے ہو تم۔۔۔شرم تو نہیں آتی نا تمھیں۔''

پھر بُو کے شدید بھبکے نے اسے یادوں کی سنہری وادی سے حقیقت کی بے رنگ، بوجھل اور ڈپریشن طاری کر دینے والی زندگی کی طرف دھکیل دیا لیکن اب کی بار چاروں طرف پھیلی بُو نے۔۔۔ماہا کا روپ دھار لیا۔

ماہا۔۔۔دانش کی کولیگ، خوبصورت، تازہ تازہ۔۔۔کسی نئی خوشبو دار صابن کی چاکی کی طرح اکڑی ہوئی، تنی ہوئی، چکنی اور خوش رنگ، ہاتھ میں آ کر اچانک پھسل جانے والی، بالکل اسی کی طرح، جس طرح وہ خود تھی مگر آج سے کوئی دس بارہ سال پہلے۔۔۔جب وقت روشنی کی رفتار سے کہیں تیز تھا۔جب پھولوں کے رنگ آج سے کہیں زیادہ شوخ تھے۔جب خوشبو، ہوا، سبزہ، اوس، موسم، منظر، سورج، تارے، سب آج سے کہیں زیادہ تیز، خوشگوار، چمکیلے اور اجلے ہوا کرتے تھے۔۔۔ماہا۔۔۔

اچانک بُو جان لیوا حد تک تیز ہو گئی۔ اسے یاد آیا کہ دانش صابن کی جگہ لکس، ریکسونا، لائف بوائے اور کیمپری وغیرہ کے نام لیا کرتا تھا اور وہ کبھی پیار سے اور کبھی غصے سے اسے سمجھایا کرتی تھی، "اس طرح تو تم چیزیں بدلنے کے عادی ہو جاؤ گے۔" اس پر دانش اسے کہا کرتا تھا، "ہوس اور محبت میں فرق ہوتا ہے۔" جب وہ نہ مانتی تو وہ تقریر کے سے انداز میں اسے سمجھایا کرتا تھا، "ہوس سراپا غلاظت ہے۔ ہوس میں چند پل کی طغیانی ہے۔ ہوس وقتی ہے۔ اس میں گہرائی نہیں ہے یہ صرف ایک سطحی جذبے کا نام ہے۔ گندگی ہے۔ جبکہ محبت۔۔۔ محبّت پاکیزہ ہے۔ محبت صاف شفاف پانی کی بہتی ہوئی ایک مسلسل ندی کا نام ہے۔ محبت ایک مقدس، بے انت گہرائی ہے۔ محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ابتدا سے انتہا تک، ازل سے ابد تک، شروع سے آخر تک، محبّت کا ہوس سے اور ہوس کا محبّت سے دور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔" یہ سن کر وہ دانش کو سمجھاتی، "محبت اور ہوس میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔۔۔ جنھیں تم دو الگ وجود سمجھتے ہو۔ یہ دونوں جُڑواں بہنیں ہیں۔ جو ایک دل، ایک جگر، ایک دماغ کے سہارے زندہ ہیں۔"

لیکن دانش کے دلائل اتنے پختہ اور باتوں میں ایسی مضبوطی اور سیلاب کی سی روانی ہوتی تھی کہ اس کے سیچے اور سیدھے سادے نظریات تنکوں کی طرح بہتے چلے جاتے تھے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تسلیم کر لیتی تھی کہ ہوس اور محبّت میں بہت بڑا فرق ہے۔۔۔ وہی فرق جو صابن اور عورت میں ہے۔

ایک مرتبہ پھر بُو کی شدّت میں اضافہ ہو گیا اور صابن کی بُو سانسوں کے ساتھ اس کی نس نس میں دوڑنے لگی اور اس کے ایک ایک خلیے کو بدبُو دار کر ڈالا۔۔۔ اس کی روح تک جسم میں کلبلا اٹھی۔۔۔ ایک بار پھر وہ ڈریسنگ روم کی طرف بھاگی اور اب کی بار تین چار پرفیوم کی بوتلیں خود پر اُنڈیل لیں لیکن صابن کی بُو اس کے چاروں اور تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ آئینے کے سامنے رک کر اس نے خود پر نظر ڈالی اور چہرے کے ایک

ایک زاویے اور جسم کو غور سے دیکھا۔ اس کا جسم کیسا بھدّا ہو گیا تھا بالکل پرانے ٹماٹر کی طرح ڈھیلا ڈھالا، پھس پھسا سا۔۔۔ کسی صابن دانی میں آخری سانسیں لیتے ہوئے گھسے گلے صابن کے بدشکل اور بے رنگ ٹکڑے کی طرح۔۔۔ جسے ابھی کسی تازہ خوشبودار صابن کی چاکی سے بدل دیا جائے گا۔

صبورہ

اس کہانی کا چودھری تقریباً ایک روایتی چودھری ہے۔ اس کی زمینوں پر کوئی دو سو سے زیادہ گاؤں آباد ہیں۔ وہ مقدمہ بازی اور شکار کے علاوہ سیاست، عورت اور شراب کا بھی دلدادہ ہے۔ مزارعوں اور کمی کمینوں پر ظلم کرنا اپنی شان سمجھتا ہے لیکن اس سب کے باوجود اسے انصاف کرنے کا بے حد شوق ہے۔ اس شوق کے باعث علاقے میں ملکی اور خدائی ضوابط کی جگہ چودھری کے خودساختہ قوانین رائج ہیں۔ منصفی کے واسطے بظاہر چودھری نے پانچ بزرگوں کی ایک نام نہاد پنچایت بھی بنا رکھی ہے مگر آخری اور حتمی فیصلہ اسی کا ہوتا ہے۔ انصاف قائم رکھنے کے لیے جیلوں اور عقوبت خانوں کا ہونا ناگزیر ہے لہٰذا ہمارے انصاف پسند چودھری نے ان خرافات کا بندوبست بھی کر رکھا ہے اور ہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ چودھری ہٹ دھرم اور اڑیل بالکل بھی نہیں ہے بلکہ بہت معاملہ فہم آدمی ہے۔ کوئی چیز اصولاً، اخلاقاً یا مذہباً کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو، اگر وہ اس کی جاگیر یا اختیارات میں اضافے کا باعث ہے تو وہ فوراً قبول کر لیتا ہے۔

ہماری اس کہانی کا چودھری روایتی اس لیے بھی ہے کہ اس نے اپنی دو جوان بہنوں کو گھر بٹھا رکھا ہے۔ ان کا رشتہ نہ ہونے کی کئی ایک وجوہات بتائی جاتی ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ زمین کے تقسیم ہونے کا ڈر ہے۔ چودھری ہے بہت شاطر، بظاہر بہنوں

سے بہت محبت جتاتا ہے۔ ان کے کھانے پینے کا خیال رکھتا ہے۔ نئے کپڑے، قیمتی زیورات، الغرض ہر طرح کی آسائش انہیں دے رکھی ہے۔ لیکن ہے بہت کائیاں آدمی۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اچھی خوراک اور آسائشوں کے باوجود، شادی کا نہ ہونا، بے عزتی کا باعث بن سکتا ہے سو اس نے بہنوں کے ساتھ دو تین بڑی بوڑھیاں پہرے داروں کی صورت میں چھوڑ رکھی ہیں۔ جو غیر محسوس طریقے سے ان کی سخت نگرانی کرتی ہیں لیکن اس احتیاط سے کہ کہیں بہنیں اپنے ویر سے متنفّر نہ ہو جائیں۔ چودھری اپنے اس حربے میں ابھی تک بہت کامیاب ہے۔ اس کی دونوں بہنیں ہر وقت شوخ بھڑکیلے لباس پہنے، سونے چاندی سے آراستہ، اپنے بھائی کے گن گاتی ہیں۔ چودھری کی بہنیں ہیں بہت چڑچڑی اور کرخت مزاج۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کام کرنے والیوں کو ڈانٹنا، معمولی باتوں پہ ان پر تشدد کرنا ہر وقت شور شرابا کرتے رہنا گویا ان کی عادت ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے چڑچڑے پن اور مزاج کی کرختگی میں خوب اضافہ ہو رہا ہے۔ جس نے چودھری کو خاصا پریشان کر رکھا ہے۔

کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ تقریباً دو سو کے قریب غریب مسکین دیہاتی ایک میدان میں بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک بڑا سایہ دار درخت ہے جس کے نیچے سیمنٹ کے چبوترے پر ایک چارپائی اور پانچ کرسیاں رکھی ہیں۔ ایک طرف ملزم کے لیے کٹہرا بنا ہوا ہے۔

چارپائی پر چودھری مونچھوں کو تاؤ دیئے، اونچا شملہ پہنے براجمان ہے۔ پیچھے ایک شخص کلاشنکوف اٹھائے کھڑا ہے۔ کرسیوں پر پانچ بزرگ تشریف فرما ہیں۔ ان کے کپڑے عام لوگوں کی نسبت زیادہ اجلے ہیں۔ کٹہرے میں ایک شہری عورت کھڑی ہے جس کی عمر کوئی چالیس سال کے لگ بھگ ہے۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور غصے کے آثار تو ہیں لیکن شرمندگی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

عورت بہت جاذب نظر دکھائی دیتی ہے۔ اس کی سفید رنگت اور تھوڑا فربہ جسم

ہلکے گلابی کپڑوں میں خوب نکھر رہا ہے۔ خصوصاً لیئرز میں ترشے بال، جنہیں گرے ڈائے کیا گیا ہے، ہلکی ہلکی ہوا سے اڑ کر قیامت برپا کر رہے ہیں۔

چودھری اس عورت کو یوں گھورتا ہے جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔ ایک آدمی چبوترے کے سامنے آتا ہے۔ اس کے پاس ایک فائل ہے اور اس کا نام گاما ہے۔

گاما: چودھری صاحب! اس فاحشہ عورت کا قصور آپ کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا اور آپ کے حکم کے مطابق ہم نے اس کو اپنا علاقہ چھوڑنے اور نام نہاد فلاحی ادارہ بند کرنے کے نوٹس بھی دیئے لیکن اس کے باوجود یہ باز نہ آئی۔ جناب! لوگ اس کے خون کے پیاسے ہیں۔ وہ اسے قتل کر دینا چاہتے ہیں لیکن قانون کی پابندی کرتے ہوئے کسی نے ابھی تک اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ جناب! میرے پاس یہ فائل موجود ہے۔ جس میں تمام مکتبۂ فکر کی طرف سے اس فاحشہ کو قتل کر دینے کے فتوے موجود ہیں۔ یہ فائل میں آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ (چبوترے پر آ کر گاما چودھری کو فائل دیتا ہے اور نیچے اُتر جاتا ہے۔)

عورت: چودھری صاحب!۔۔۔ مجھے اس طرح لوگوں کے سامنے مجرم بنا کر کٹہرے میں کھڑا کرنا۔۔۔ قانوناً جرم ہے اور میں آپ جیسے پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے شخص سے اس طرح کی اُمید نہیں رکھ سکتی کہ آپ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیں گے۔۔۔ پلیز! مجھے یہاں سے جانے دیا جائے۔

(چودھری فائل چارپائی پر رکھ کر عورت کو سر سے پاؤں تک گھورتا ہے لیکن ایک لفظ نہیں بولتا۔۔۔ شاید "پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے" جیسے الفاظ اس کی زبان بند کر دیتے ہیں پنچایت میں سے ایک بزرگ بول پڑتے ہیں۔)

بزرگ نمبر 1: دیکھ لڑکی! زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کر۔ اس علاقے کا یہی اصول ہے کہ ہم اپنے فیصلے خود کرتے ہیں۔۔۔ اور تو یہ اچھی طرح جانتی ہے۔ تیرے لیے یہی بہت ہے کہ ہم تجھے صفائی کا پورا پورا موقع دے رہے ہیں۔

عورت: دیکھیں آپ کی اس حرکت سے۔۔۔ آپ لوگوں پر ملک سے بغاوت کا مقدمہ بھی چل سکتا ہے۔

بزرگ نمبر 2: (طنزیہ ہنس کر)۔۔۔ تو ہمیں ڈراتی ہے؟ ہم تو مقدموں کو مرد کا زیور سمجھتے ہیں۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم یہاں خاموش کھڑی رہو۔ ہمارے ایک اشارے پر یہ لوگ تمہاری تکہ بوٹی کر دیں گے۔ چودھری صاحب کا شکریہ ادا کرو۔ جن کی وجہ سے ابھی تک تمہاری جان سلامت ہے اور تمہیں صفائی کا موقع دیا جا رہا ہے۔ لہٰذا تمہاری زبان سے اب ایک لفظ نہ نکلے۔ (عورت بولنے لگتی ہے مگر غصے سے سر جھٹک کر خاموش ہو جاتی ہے)

بزرگ نمبر 1: گامے! تو گواہ پیش کر۔

گاما: سرکار! یہ عورت عرصہ دو سال سے ہمارے مختلف گاؤں کے چکر لگاتی رہی، اس نے بیواؤں، طلاق یافتہ عورتوں اور بڑی عمر کی غیر شادی شدہ خواتین کی فلاح کا ڈھونگ رچایا، بظاہر سلائی مشینوں اور امداد کا جھانسہ دیا اور در پردہ انہیں فحاشی کی تعلیم دیتی رہی۔ میرے پاس گواہ تو بہت سارے ہیں لیکن اس وقت آپ کے سامنے میں پانچ گواہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔۔۔

چودھری: اجازت ہے۔

گاما: بشیرے! آ اور گواہی دے۔

بشیرا: (چودھری کی طرف ہاتھ جوڑ کر) چودھری صاحب کی خیر ہو۔۔۔ جناب! اس عورت نے میری بیوہ بھابھی کو پہلے ایک سلائی مشین دی۔ پھر اس سے دوستی کر لی اور پھر وہ گناہوں اور بے حیائی کی راہ پر چل نکلی۔۔۔ وہ کافی شریف عورت تھی جی! اس نے اسے خراب کیا ہے۔ اسے نئے اور انوکھے کام پر لگا دیا ہے۔ میری آپ سے یہی درخواست ہے کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔ (بشیرا چلا جاتا ہے)

گاما: چل بھئی نذیرے! تو بول۔

نذیرا: (ہاتھ جوڑ کر لیکن غصہ میں) جناب کی خیر ہو۔۔۔ جناب! اس حرامزادی نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا (عورت غصے میں ہونٹ دانتوں میں چبا کر ناگواری کا اظہار کرتی ہے) چودھری صاحب! میری بدقسمت طلاق یافتہ بہن، جو سلائی کڑھائی کا کام جانتی تھی، اس کنجری کے ہتھے چڑھ گئی۔ یہ بازار سے اسے کپڑا دھاگہ لا کر دیتی تھی۔ وہ کپڑوں پر کڑھائی کرتی اور یہ ان کپڑوں کو بازار میں بیچ آتی تھی۔ اس طرح اس نے میری بہن سے دوستی کر لی۔ اس کی سہیلی بن کر اسے فحاشی کی راہ پر لگا دیا۔۔۔ یہ بڑی کمینی عورت ہے جی! پتا نہیں کیا کیا گند اُسے بازار سے لا کر دیتی تھی۔ اسے سزائے موت ہونی چاہیے۔ سزائے موت!! (عورت غصے سے نذیرے کو گھورتی ہے)

گاما: بس کر نذیرے! (نذیرا چلا جاتا ہے) چل بھئی شیدے! تو آ اور بتا اس کے کرتوت۔ (چودھری تھوڑے وقفے سے اپنی بھیڑیا صفت نگاہیں عورت کے جسم سے مَس کرتا ہے۔)

شیدا: (ہاتھ جوڑ کر) سرکار کی خیر ہو۔ سرکار یہ ڈائن ہے ڈائن۔ اس چڑیل نے پہلے میری بڑی بہن کو سلائی مشین دی۔ پھر اس سے میل جول بڑھایا۔ آپ کو تو پتا ہے بچپن میں میری بہن کا منہ جل گیا تھا۔ اسی وجہ سے ابھی تک اس کی شادی بھی نہیں ہو سکی۔۔۔ اس ڈائن نے اس قسمت کی جلی کو انتہائی گندے راستے پر ڈال دیا ہے جی۔ (جذباتی ہو کر) چودھری صاحب! آپ کے ایک اشارے کی ضرورت ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ خدا کا واسطہ ہے آپ مجھے حکم دیں میں اسے کچا چبا جاؤں گا۔ (عورت غصے سے چہرے پر آئی لٹ کو جھٹکتی ہے)

گاما: (کندھے پر ہاتھ رکھ کر) بس شیدے! بس کر! اسے ضرور سزا ملے گی۔۔۔ تو بیٹھ جا (شیدا روتے ہوئے بیٹھ جاتا ہے۔ گاما اگلے گواہ کو پیش کرنے لگتا ہے۔)

بزرگ نمبر 3: بس گامے بس! گواہ تو دو ہی کافی تھے۔(چودھری سے مخاطب ہوکر) چودھری صاحب! میرا خیال ہے کہ اب آپ اس عورت کو صفائی پیش کرنے کا موقع دیں۔۔۔تا کہ ہم فیصلہ سنا سکیں۔

بزرگ نمبر 4: ایک منٹ چودھری صاحب! گواہی ابھی مکمل نہیں ہوئی (عورت لاتعلق ہوکر کھڑی رہتی ہے) اگر آپ اجازت دیں تو میں گواہوں سے کچھ سوال پوچھ سکتا ہوں؟

چودھری: اجازت ہے (بھیڑیا ایک بار پھر شکار کا جائزہ لیتا ہے)

بزرگ نمبر 4: تینوں گواہ ذرا سامنے آئیں (گواہ سامنے آتے ہیں)۔۔۔دیکھو!۔۔۔ مسئلہ کسی کی زندگی اور موت کا ہے اور انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم بات ذرا کھل کے کریں۔۔۔گو کہ بات شرم کی ہے مگر مجھے واضح الفاظ میں اس کا جواب دو کہ تم نے جن عورتوں کا ذکر ابھی کیا ہے۔کیا انہیں تم نے خود اپنی آنکھوں سے کسی مرد کے ساتھ دیکھا ہے؟

تینوں: نہیں جی!

بزرگ نمبر 4: کیا مطلب (باقی بزرگوں کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے) یہ سب کیا ہے؟ (بزرگ نمبر 5 جسے سارے معاملے کا پتا ہے۔وہ بزرگ نمبر 4 کے کان میں ایک طویل سرگوشی کرتا ہے۔جس سے بزرگ نمبر 4 کے چہرے کا رنگ متغیّر ہوتا ہے اور وہ خاموش ہو جاتا ہے۔)

بزرگ نمبر 5: (لوگوں سے مخاطب ہوکر) اصل میں حاجی صاحب کو اس معاملے کی بالکل خبر نہیں تھی۔آپ سب کو تو پتا ہے کہ یہ پانچ چھ مہینے سے یہاں نہیں تھے۔اس لیے انہوں نے ایسا سوال پوچھا، ورنہ ہم سب جانتے ہیں کہ اصل معاملہ کیا ہے اور کس قدر شرم ناک ہے۔ چودھری صاحب! اب آپ ملزمہ کو صفائی کا موقع دیں۔

چودھری: (اپنا شملہ اتار کر چار پائی پر رکھتے ہوئے رحم اور ہوس بھری نظروں سے عورت کو دیکھتا ہے) آپ اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتی ہیں؟ (یہ کہہ کر چودھری بظاہر لوگوں پر نظریں جما لیتا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں دائرے اور قوسیں گھومنے لگتی ہیں۔)

عورت: (بارعب انداز میں) چودھری صاحب! میرے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے۔ یہ سراسر ناانصافی ہے۔ یہ زبردستی ہے میرے ساتھ۔۔۔

بزرگ نمبر 1: (بات کاٹ کر) دیکھ لڑکی! تم اسے زبردستی سمجھو یا ظلم یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ تم نے ہمارے علاقے کی ناموس سے کھیلنے کی کوشش کی ہے اور اس کی سزا موت ہے۔۔۔ صرف موت۔۔۔ ہم پہلے بھی تمہیں بتا چکے ہیں کہ ہمارے نزدیک تمہیں صفائی پیش کرنے کا بھی حق نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر یہ چودھری صاحب کا فیصلہ ہے۔ اس لیے ہم لوگ تمہیں یہ حق دے رہے ہیں۔ اب تم وقت ضائع نہ کرو۔ اگر تم نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے تو کہو مزید ہمارے صبر کا امتحان مت لو۔۔۔ سمجھیں تم!

عورت: (اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کچھ توقف کے بعد) چودھری صاحب! میرا جی تو نہیں چاہتا کہ میں ایک لفظ بھی کہوں لیکن ان لوگوں کی ضد پوری کرنے کے لئے اور آپ کی اس عنایت کی خاطر کہ آپ نے مجھے صفائی کا موقع دیا ہے۔۔۔ میں اپنی صفائی پیش کرتی ہوں (طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ) بہر حال مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اس جنگل میں بھی انصاف قائم کر رکھا ہے (چودھری کے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی ایک لہر نمودار ہوتی ہے) مجھے بولنے کی اجازت ہے؟

چودھری: اجازت ہے۔

عورت: (پنچایت کی طرف مڑ کر) میرے متعلق گواہوں نے جو بیان دیئے ہیں۔ وہ سراسر الزام ہیں اور بہتان طرازی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ میں نے ہمیشہ

عورت کو باعزت اور باوقار زندگی گزارنے کا درس دیا ہے۔ میرا تو مقصد ہی یہ ہے کہ عورت اس تنگ نظر معاشرے میں بدچلن اور فاحشہ جیسے الفاظ سے محفوظ رہے۔ اسی غرض سے میں انہیں معاشی طور پر مضبوط کرنے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ کہیں معاشی بدحالی انہیں غلط راستے پر نہ ڈال دے لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ اس سب کے باوجود الٹا مجھ پر یہ الزام لگایا جارہا ہے کہ میں عورتوں کو فحاشی کے راستے پر ڈال رہی ہوں۔ جناب! چودھری صاحب! اگر میں کوئی ایسا گھناؤنا مقصد لے کر گاؤں کا رخ کرتی تو آپ خود سوچیں کہ کیا میرا نشانہ بیوائیں اور طلاق یافتہ یا غیر شادی شدہ بڑی عمر کی عورتیں ہوتیں یا کمسن کنواریاں؟۔۔۔

بزرگ نمبر 4: (غصے سے) منہ سنبھال کر لڑکی! (چودھری ہاتھ کے اشارے سے بزرگ کو چپ کروادیتا ہے۔ اب چودھری کی آنکھوں میں وحشت کے ساتھ ساتھ تفکر کی ہلکی سی جھلک دکھائی دے رہی ہے)

عورت: (بات جاری رکھتے ہوئے) چودھری صاحب! جن عورتوں کی بات ابھی ان گواہوں نے کی ہے۔ وہ صرف مردوں کے سامنے نہیں بلکہ عورتوں کے سامنے بھی اپنا جسم ڈھانپ کے رکھتی ہیں۔۔۔ گامے! گواہوں کو میرے سامنے پیش کر۔۔۔ (گواہ آتے ہیں) بتا بشیرے! تیری بھابھی مردوں کے ساتھ تنہائی میں جاتی ہے؟

بشیرا: (سر جھکا کر) نہیں۔

عورت: کیا وہ ایسے کپڑے پہنتی ہے جس پر تمہیں یا کسی اور کو یہ اعتراض ہو کہ اسے دیکھ کر تم لوگوں کی ہوس بھڑکتی ہے؟

بشیرا: نہیں۔

عورت: کیا تم نے اس کی کوئی ایسی حرکت دیکھی ہے جس کی وجہ سے تم یہ کہہ سکو کہ اس

نے کسی مرد یا عورت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہو۔؟

بشیرا: (گھبراتے ہوئے) نہیں جی!

عورت: نذیرے! تجھے ان تینوں باتوں میں سے کوئی شکایت اپنی بہن سے ہے؟

نذیرا: نہیں۔

عورت: شیدے! تجھے؟

شیدا: نہیں جی۔!

عورت: (لمبا سانس لے کر) پھر فحاشی کہاں ہے؟۔۔۔ کیا ہے فحاشی؟۔۔۔ کسے آپ لوگ فحاشی کہتے ہیں؟۔۔۔ کیا یہ پنچایت کسی ایسی عورت کو سزا دینے کا حق رکھتی ہے جس پر یہ الزام ہو کہ وہ اپنے غسل خانے کے اندر، چھپ کر دیکھ لیے جانے سے، برہنہ نظر آتی ہے؟۔۔۔ ارے کچھ تو عقل کو ہاتھ ڈالو۔۔۔ اپنے بند ذہنوں کو کھولنے کی کوشش کرو۔۔۔ (چودھری حیرت سے اسے دیکھ رہا ہے مجمع پر خاموشی طاری ہے) میرا جرم صرف اتنا ہے۔ میرا قصور صرف یہ ہے کہ میں عورت کو عزت کی زندگی گزارتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں یہ ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔۔۔ کہ اگر مرد اور عورت ایک ہی فعل کے مرتکب ہوں، تب مرد کو تو سورما اور ہیرو تصور کیا جائے مگر عورت کو ذلیل اور نیچ اور فاحشہ کہا جائے۔ بس! اتنی سی بات تھی، صرف اتنی بات تھی چودھری صاحب! میں نے ان عورتوں کو محض یہ تعلیم دی ہے کہ جب تک مرد میں اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ساتھ تنہائی میں جانے والی کی عزت کرے اور جب تک تمہارا معاشرہ تمہیں تمھاری اصل حیثیت میں قبول نہیں کرتا۔ اس وقت تک تم اپنے تخیّل کے سہارے اپنی تنہائی کو روشن کر لیا کرو۔۔۔

بزرگ نمبر 3: (غصے سے سرخ ہو کر) چودھری صاحب! کیا آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ عورت حد سے بڑھتی جاتی ہے؟

بزرگ نمبر 4: (جذباتی ہو کر) چودھری صاحب! اس نے نیا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔۔۔ یہ نئی اور انوکھی رِیت ڈال رہی ہے۔ ہمیں اسے اتنی کھلی چھٹی نہیں دینی چاہیے۔ ہم آپ کی اجازت کے منتظر ہیں۔

(مجمعے سے بھی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں)

عورت: (اسی طرح اونچی آواز میں بولتے ہوئے) چودھری صاحب! آپ نے مجھے بولنے کی اجازت دی تھی۔

چودھری: (پنچایت کو ہاتھ کے اشارے سے روک کر، عورت پر نظریں جمائے، متفکر لہجے میں) تم بولتی جاؤ۔

عورت: (چودھری سے نظریں چار کر کے) شکریہ! میں نے صرف دو باتیں اور کرنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجھ پر بار بار الزام لگایا جا رہا ہے کہ میں نے کوئی انوکھا کام شروع کیا ہے۔۔۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔۔۔ میں کوئی نئی رِیت نہیں ڈال رہی۔ یہ رِیت بہت پرانی ہے۔ اتنی پرانی کہ جتنی انسان کے متمدن معاشرے کی تاریخ پرانی ہے۔ میرے پاس بہت سے تاریخی شواہد بھی موجود ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جب ہم کسی کام کے متعلق یہ جان لیں کہ وہ ہر دور اور ہر جگہ پر ہوتا رہا ہے تو ہم کسی نہ کسی حد تک اسے جائز سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن اس ماحول میں (طنزیہ انداز میں) تاریخی حوالے پیش کرنا۔ مجھے حماقت اور بیوقوفی لگتا ہے۔۔۔ کیونکہ۔۔۔

چودھری: (بات کاٹ کر غصے سے)۔۔۔ کیونکہ اس وقت تمہارے سامنے اَن پڑھ اور جاہل لوگ ہیں؟

عورت: (سر جھکا کر) جی ہاں!

چودھری: (قدرے غصے سے) تم ہمیں کیا سمجھتی ہو؟

عورت: میری یہ رائے آپ کے بارے میں نہیں ہے۔

چودھری: پھر بولتی جاؤ ہم سن رہے ہیں۔

عورت: چلیں اسے میری بیوقوفی کہیے یا کچھ بھی کہہ لیجیے میں پنچایت کے سامنے کچھ تاریخی شواہد پیش کرتی ہوں ۔۔۔ تو سنیے بابل اور آشوریہ کے قدیم کھنڈروں میں جو محلات اور مندر دریافت ہوئے ہیں۔ ان پر صبورہ کی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ برٹش میوزیم میں قدیم یونانی گلدانوں پر اس کی تصویریں موجود ہیں۔ اس طرح صبورہ کی تاریخ پانچ چھ ہزار سال پرانی ہے۔ (لوگ ان باتوں سے بالکل بیزار بیٹھے ہیں۔ پنچایت کے بزرگ بظاہر غور سے سن رہے ہیں لیکن ان کے چہرے سے پتا چلتا ہے کہ انہیں کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا، بہر حال چودھری کے چہرے سے پتا چلتا ہے کہ جیسے وہ ساری بات سمجھ چکا ہے۔ عورت چودھری کی طرف متوجہ ہو کر) چودھری صاحب! یہ ریت کسی ایک قوم یا ایک ملک تک محدود نہیں تھی۔ آپ اس کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ تقریباً ہر زبان میں صبورہ کا نام موجود ہے۔ جاپانی میں اسے اینگی کہا جاتا ہے۔ قدیم یونانی میں اسے اولسبوس کہتے تھے۔ لاطینی میں اسے فلس اور فرانسیسی میں گادمیشہ اور جرمنی میں سمتھانسے، اطالوی میں اس کا نام پاشاٹمپو اور انگریزی میں اسے ڈلڈو اور ہندوستان میں اسے صبورہ کہا جاتا ہے۔ الغرض ہر زبان میں اس کا نام موجود ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ کوئی نئی ریت نہیں ہے اور آخری بات جو میں کہنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ (باقی تمام لوگ بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھے ہیں لیکن چودھری کے چہرے پر تفکر بہت نمایاں ہو گیا ہے) اصل میں تو میں عورت کی عزت چاہتی ہوں کہ اسے استعمال کے بعد ذلیل اور حقیر نہ سمجھا جائے لیکن گھوم پھر کر اس کا فائدہ آپ مردوں کی طرف ہی جاتا ہے کہ آپ کی غیر شادی شدہ بہنیں جن کی شادی غربت یا بدصورتی کی وجہ سے نہیں ہوئی یا جنہیں تم جائیداد کی لالچ میں غیر شادی شدہ رکھتے ہو (چودھری حیرت اور غصے سے اس

کی طرف دیکھتا ہے) وہ اپنی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی سے چھپ کے تعلق قائم نہیں کرتیں۔۔۔تمہاری مطلقہ اور بیوائیں تم ہی جیسے ہوس پرستوں کا نشانہ بن کر ذلیل و خوار نہیں ہوتیں۔ انہیں عزت نہیں دے سکتے ہو تو کم از کم ان سے یہ سب تو نہ چھینو۔

یہ سن کر لوگوں کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ چودھری کے روکنے کے باوجود لوگ اس کے غیظ و غضب کی پروا کیے بغیر چبوترے پر چڑھ گئے اور عورت کو مارنے پیٹنے لگے۔ چودھری نے اس فاحشہ کو وقتی طور پر بچالیا اور بہانہ یہ کیا گیا کہ پنچایت کے فیصلے سے پہلے اس پر تشدد کیوں کیا گیا ہے؟ لہذا جان بوجھ کر فیصلے میں ایک ہفتے کی تاخیر کی گئی۔ اتنے عرصے کے لیے عورت کو چودھری کے عقوبت خانے میں بند کر دیا گیا۔ لوگ ایک ہفتہ احتجاج کرتے رہے۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد خبر آئی کہ اس عورت کو پنچایت کے سامنے علی الصباح پھانسی دے دی گئی ہے۔ پنچایت کے ارکان بھی لوگوں کے سامنے خدا رسولؐ کی قسمیں کھا کر اس خبر کی تصدیق کرتے رہے۔ لوگوں کو ابھی بھی شک ہے کہ وہ فاحشہ زندہ ہے۔ وہ کہاں ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا بہر حال لوگوں کو یہ یقین ہے کہ اب وہ انہیں کبھی دکھائی نہ دے گی۔ ان کے لیے اتنا اطمینان ہی کافی ہے۔۔ اور ہاں! یہ خبر سوال بن کر ہر شخص کے ذہن میں ہے جس کا اظہار کوئی نہیں کرتا کہ چودھری کی بہنوں کے مزاج اب اتنے کڑوے اور کرخت کیوں نہیں رہے جتنے پہلے ہوا کرتے تھے؟

زمین کی چھاپ

وہ چاہتا تھا کہ زمین کی چھاپ اس کے چہرے سے نوچ لی جائے۔توبہ توبہ!
بارہ سال کا بچہ اور ایسا بیہودہ خیال۔وہ ڈر گیا تھا۔میں نے اسے حوصلہ دینے کے لیے دل
سے لگالیا۔اس کی ماں پتھر کی ایسی مورتی بن گئی تھی جس کی آنکھوں سے چشمے جاری تھے۔

اس وقت، مجھے اس لڑکے کے دادا پر بہت رحم آیا (جواب اس دنیا میں نہیں
ہے) وہ اس چھاپ پر بہت فخر کرتا تھا۔لوگوں میں بیٹھ کر جب وہ بہادری اور آزادی کے
قصے سناتا تو اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا تھا اور آنکھوں میں نمی آجاتی تھی۔جرأت اور حریت
اس کے چہرے پر چمکتی تھی۔آج جب اس خوش فہم بوڑھے کی تصویر میری نظروں میں
گھومی تو مجھے اس جرأت اور حریت سے تمتمائے چہرے پر حماقت کا لیپ بھی نظر آیا۔میں
نے سر جھٹک کر اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔

ابھی یہ خوف ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک اور دھماکہ ہوا۔۔۔خودکش ہوگا؟

بچے نے پھر منصوبے سوچنے شروع کر دیے کہ بھاگ کر جائیں تو جائیں کہاں؟
وہ خود سے،مجھ سے اور اپنی ماں سے لڑتا رہا کہ آخر یہ ملک چہرے پر کیوں چھپ جاتے ہیں؟
مورتی کی آنکھوں سے چشمے جاری ہو گئے۔میں نے لڑکے کو حوصلہ دینے کے
لیے دل سے لگالیا۔

اس وقت مجھے اس لڑکے کے وکیل تایا پر بہت ترس آیا۔ جو آج کل بندوقوں اور گولیوں کے سامنے آزاد عدلیہ کے نعرے لگا رہا ہے۔ وہ بھی جب لوگوں میں بیٹھ کر بڑے اعتماد سے ملکی مسائل کا حل بتاتا ہے تو اس کے چہرے کی مہین نسیں تن جاتی ہیں۔ چہرہ جرأت اور حریت سے جگمگانے لگتا ہے۔ میں نے پھر حماقت سے لیپے ہوئے چہرے کو ایک جھٹکے سے دور کیا۔

یہ لو ایک اور ہوا۔۔۔ خودکش ہوگا؟

''کیا ہم پلاسٹک سرجری کروا کر چینی یا جاپانی نہیں بن سکتے؟؟؟''

پھر چشمے جاری ہو گئے پھر میں نے حوصلہ دینے کے لیے اسے دل سے لگا لیا اور میری نظروں میں کئی چہرے گھوم گئے۔ جن پر حماقت کا لیپ تھا۔

پیوند

"ہوس کی خاردار جھاڑی پر۔۔۔ محبت کی لطیف ٹہنی کی پیوند کاری کیوں کی آپ نے؟ ایسا کہیں ہوتا ہے کیا؟ سب کچھ آپ نے مِکس اَپ کر دیا ہے۔ ہلکی سُہانی خوشبو میں، نتھنے چیرتی تیز بُو، مجھے تو اُبکائی آنے لگی ہے۔ سب برباد کر دیا، باغ کا باغ اُجاڑ دیا ہے آپ نے۔" وہ اچانک اپنے باپ پر برس پڑی۔

باپ حیران رہ گیا۔ پہلے تو کبھی اس نے اس اُبلتے ہوئے لاوے کی کوئی سُن گُن نہ دی تھی۔ "ارے بیٹا! کیا ہو گیا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" باپ نے پیار بھرے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔۔۔ "میں نہیں بولتی آپ سے، مجھ پر ظلم کیا ہے آپ نے"۔۔۔ وہ رونے لگی۔۔۔ باپ نے کوشش کی مگر اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔ باپ نے حکمت کی راہ اختیار کی۔۔۔ "دیکھو! جب یہ پیوند کاری ہو رہی تھی۔ یہ تو تب سوچنا تھا۔ ہم دونوں نے اپنی مرضی سے کیاری کی زمین ہموار کی۔ ان چاروں ہاتھوں نے زمین کی زرخیزی کو بڑھایا۔ پیوند لگایا میں نے تھا۔ پر اس کی آبیاری تم کرتی رہی تھیں۔ دیکھو! تمھیں میں نے بتایا تھا کہ پہلے کبھی یہ پودے ایک ہی ہوا کرتے تھے۔ یہ تو زرعی ماہرین نے تجربے کر کے انھیں الگ کر دیا تھا۔ میں تو"۔۔۔ وہ بات کاٹ کر چلائی "میں یہ سب نہیں مانتی، یہ خرافات آپ کے غلیظ ذہن کی پیداوار ہیں۔ فضول کتابوں کی دین ہیں۔ میری کوئی مرضی نہیں

تھی۔ میری مشرقی زمینوں میں یہ شجرِ ممنوعہ ہے''۔۔۔طویل خاموشی کے بعد لڑکی نے دانائی کا دامن تھام لیا۔۔۔''دیکھیے! میں ایک عورت ہوں۔ مجھے باغ کی حفاظت کے لیے ایک مضبوط مالی کی ضرورت پڑتی ہے۔۔۔پر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ناکارہ ہوں۔۔۔باغ کی نشوونما کرنا میرا فریضہ ہے۔ محبّت کے پھول مہکا کر میں مہین کونپلوں کو تناور درخت بناتی ہوں۔ یہ فرض ہے میرا۔۔۔یہ میری جبلّت میں داخل ہے۔ یہ۔۔۔یہ وہ تربیت ہے، جو خود قدرت نے کی ہے میری۔۔۔میں یہ بھی جانتی ہوں کہ۔۔۔میری کمزوری ہے کہ ہوس کی باڑ میرے چاروں اور رہے۔۔۔کبھی کبھی کپڑے اٹکیں۔۔۔دھاگے نکلیں، کانٹے چبھیں۔۔۔لیکن کبھی کبھار۔۔۔یہ درد اور اس کا مداوا، ہم عورتوں کی میراث ہے لیکن اس رشتے کے ساتھ۔۔۔وہ بھی عین باغ کے وسط میں۔۔۔یہ جھاڑیاں۔۔۔یہ پیوند کاری یہ کڑوے کسیلے پھل۔۔۔کہا نا! مجھے ان پھولوں اور پھلوں سے اُبکائی آتی ہے۔ آپ کو بھی آتی ہوگی اگر نہیں بھی آتی تو کیا آپ اس خوشبو اور پھل کا سرِعام تذکرہ کر سکتے ہیں؟''

۔۔۔باپ ٹوک کر چلایا''اور کتنی چیزیں ہیں جن کے تذکرے سرِعام ہوتے ہیں''۔۔۔اس کی آواز باپ سے بھی اونچی ہوگئی۔۔۔''میں بحث نہیں چاہتی۔ یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے۔ اس کا ازالہ''۔۔۔کمرہ دیر تک خاموشی میں لت پت رہا۔ جب سانسوں اور دھڑکنوں کی ترتیب ایک ردھم پر آگئی۔ تو باپ سوچتے ہوئے بولا''ہوں۔۔۔اس کا ازالہ۔۔۔اس پر سوچنا پڑے گا۔ چل ایک وائن کا دور چلاتے ہیں''۔۔۔''اب یہ نہیں ہوگا۔''وہ پاگلوں کی طرح بولی۔۔۔وہ ضد پر آگئی تھی۔۔۔''کہا جو ہے۔ سوچتے ہیں، شور کیوں مچاتی ہو، تھوڑا وقت دو۔۔۔چلو! شاباش لے آؤ دو گلاس۔''باپ نے آرام سے سمجھاتے ہوئے کہا پر وہ بدتمیز ہوگئی تھی۔۔۔''میرا فیصلہ کرو۔۔۔یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے۔ میں نے نہیں رہنا اس بدبُو میں تجھ بڈھے کے ساتھ۔۔۔تو نے وہ کیا جو نہ سنا نہ دیکھا''۔۔۔وہ چیختی چلاتی رہی۔۔۔باپ کا جوفِ سینہ غضب سے لبالب بھر گیا۔۔۔''بکواس بند کر! تُو بھی کوئی بچی نہیں تھی۔ کوئی نیا باپ ڈھونڈھ لیا ہے تُو نے حرامزادی!۔۔۔نیچ بوتے تجھ کنجری کو حیا نہ

آئی۔ گوڈی، کھرپہ، سب ٹھیک تب پھولوں کے رنگ سہانے تھے۔ اب جو پھل دیکھا تو لگی چیخنے۔ سارے باغ کی تباہی مجھ پر؟"۔۔۔ باپ کا سینہ خالی ہوا تو بیٹی کی باری آئی۔۔۔ "ہاں ہاں میں جو بھی ہوں۔ جیسی بھی ہوں ٹھیک ہے۔ پر تیرے ساتھ کیوں رہوں۔ تُو بتا، کل تو نے مَر کھپ جانا ہے۔ میرے سامنے ایک طویل عمر پڑی ہے۔ کیا بتاؤں گی، کہاں کا بیج ہے؟ ایسے پھل سے تو میرے باغ کی مٹی داغی ہو جائے گی۔ میں کیا کروں گی؟ تیرے بعد تو اس باغ میں کسی مالی نے نہیں گھسنا، میں برباد ہوگئی۔ میں تیرے ہاتھوں تباہ ہوگئی"۔۔۔ رودھو۔۔۔ چیخ چاخ کر۔۔۔ بالآخر باپ نے کہا، "چل کرتے ہیں فیصلہ۔ بنالا دو گلاس۔" جب بنانے لگی تو باپ نے فرمائش کی، "جا آخری بار وہی لباس پہن آ" ۔۔۔ وہ آزاد ہونے کی دُھن میں خوشی خوشی پہن آئی۔۔۔ پیوند ہوئی ٹہنی سے پھل گرا دیا گیا۔۔۔ نئی زمینیں اس کے حوالے کر دی گئیں۔۔۔ باپ نے رات سونے سے پہلے اسے سمجھایا۔۔۔ "نئے باغ کا مالی زیادہ ماہر نہ ہونا چاہیے۔ مبادا وہ تیرے منہ سے اس کڑوے پھل کا ذائقہ چکھ کر بھاگ نہ جائے۔"

اگلے روز صبح جب وہ باغ سے جا رہی تھی تو بڈھا باپ اس کی چھوٹی بہن کو پیوند کاری کے اصول سمجھا رہا تھا۔ اس نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا۔۔۔ پھر خود غرضی کی چادر اوڑھ، نئے باغ کی دُھن میں، اناڑی مالی کے سپنے سجائے، پرانے شہر کی طرف لوٹ گئی۔

افسانہ لکھنا ایک خاص ہنر ہے اور جدید عہد نے اُردو افسانے کو جس مقام پر فائز کیا یہ وہی مقام ہے جہاں منٹو اور بیدی اسے دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ سیّد ماجد شاہ نے اس صنف میں رہنے کے لیے جس راستے کا انتخاب کیا وہ بہت کٹھن اور دشوار گزار ہے۔ اس دشواری کی ایک نوعیت تو یہ بنتی ہے کہ ایک عام افسانہ نگار جن موضوعات کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور بات کرتے کرتے موضوع بدل دینا چاہتا ہے وہاں ماجد نے نہ صرف اپنی آنکھیں کھلی رکھیں بلکہ پڑھنے والوں کی آنکھیں بھی کھول دی ہیں۔ اس کتاب کے تمام افسانے فنی وفکری سطح پر مستحکم ہیں۔ زبان و بیان میں سادگی بھی ہے اور کہیں کہیں مشکل پسندی بھی نظر آتی ہے۔ ہر کہانی میں ایک ایسا جادوئی منظر چھایا ہوا ہے جس نے کرداروں کی باطنی دنیا روشن کر دی ہے۔

ڈاکٹر تھامس اسٹیمر

سیویلا یونیورسٹی (سپین)

ان افسانوں کا مطالعہ شاعرانہ لطف سے خالی نہیں ہے۔ ایک ایک سطر میں تپتے جذبوں کی حرارت اور کیفیت رُوح میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ حیرت ہے کہ پاکستان میں بھی اب اُس ممنوعہ شجر پر لکھنے والے موجود ہیں جس پر مغرب میں بھی کم کم ادیب ہاتھ ڈالتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو ان موضوعات میں قدرے کرختگی محسوس ہو اور اُن کی انانیت پر ضرب بھی لگے کیوں کہ یہ افسانے جس سماج کی عکس بندی کرتے ہیں وہاں روایات اور اقدار کی بڑی پاسداری کی جاتی ہے۔۔۔ ایسے تنگنائے میں اظہار کی نئی راہ تراشنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ مجموعہ جہاں بے زار افسانوی مضامین پر ایک کھلی تنقید ہے وہاں جدید افسانے کی معقولیت میں اہم اضافے کا باعث بھی ہے۔ ایک صاحبِ بصیرت افسانہ نگار ہی اس نوع کی عصری صورتِ حال پر لکھ سکتا ہے۔ یہ تمام افسانے مابعد جدید حسیت کا ایک ایسا پیراڈائیم فراہم کرتے ہیں جس میں دیکھنے والی نظر بہت کچھ دیکھ سکتی ہے۔

ڈاکٹر لڈمیلا ویسلوا

انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز رشین اکیڈمی سائنس

ماسکو (روس)

Ph:+92-41-2643841, Cell:0300-6668284